دو کشتی کے مسافر
فریدہ عالم

دو کشتی کے مسافر

فریدہ عالم

نام کتاب : دو کشتی کے مسافر

مصنف : فریدہ عالم

سال اشاعت : ۲۰۱۰ء

تعداد : ۳۰۰

قیمت : ۱۵۰ (ایک سو پچاس روپے)

کمپوزنگ : روائل کمپوزنگ ورکس

سبھاش مارکٹ، لنگرٹولی چوراہا، پٹنہ۔۴

ناشر : پرویز بک ہاؤس، سبزی باغ، پٹنہ۔۴

ملنے کا پتہ : ۱۶، گنگا ٹاور، معین پورہ، پٹنہ

موبائل : 9334711976

فہرست

ان بزرگوں کے نام جن کے پیار اور ہمت افزائی نے مجھے میرا شوق پورا کرنے کا موقع دیا۔ ان بزرگوں میں سے کوئی بھی اب دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان لوگوں کے خلوص اور پیار ہمارے لئے مشعل راہ ثابت ہوئے ہیں۔

دادا، ابا محمد یحییٰ صاحب مرحوم، دادی اماں سلمٰا خاتون مرحومہ

ہمارے نانا جان سید محمد یوسف صاحب مرحوم

ہمارے والد صاحب سید محمد مناظر عالم صاحب مرحوم

ہماری والدہ سلطان آرا عالم مرحومہ

ہمارے سسر صاحب، سید محمد محسن صاحب مرحوم

ہمارے ماموں جان سید محمد عثمان یوسف صاحب مرحوم

پیش لفظ

فریدہ عالم صاحبہ کے افسانوں کے مجموعہ ''دو کشتی کے مسافر'' کا میں نے مطالعہ کیا۔ مختصر افسانے لکھنا ایک مشکل کام ہے کیونکہ آپ کو کم الفاظ میں بات کہنی ہے۔ لفاظی کی گنجائش نہیں۔ اچھی کہانی قاری کی سانس روک دیتی ہے۔ اسے حیرت و استجاب کے عالم میں ڈالتی ہے۔ اسے کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ انجیل کی خراج بیٹے کی پیربل، کو لیجئے پانچ سو الفاظ میں کی یہ کہانی ایک واقعہ کو تین کردار کے زاویہ نگاہ سے دیکھتی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ دنیا کا سب سے اچھا مختصر افسانہ ہے۔ ایک بیٹا جو بہت ہی خراج ہے اپنی جائیداد کا حصہ بانٹ کر دوسری جگہ چلا جاتا ہے۔ قحط پڑنے پر اسکی بری حالت ہو جاتی ہے اور وہ باپ کے پاس واپس آجاتا ہے اور اپنے گناہوں سے توبہ کرتا ہے۔ اسے باپ خوش آمدید کہتا ہے لیکن دوسرے بیٹے کو یہ بات پسند نہیں آتی ہے۔ کہانی ختم ہوتی ہے جب باپ کہتا ہے کہ تمہارا بھائی مر گیا تھا، اب وہ زندہ ہو گیا ہے۔ وہ گم ہو گیا تھا اب مل گیا ہے۔ اس لئے خوشی مناؤ۔ آپ موپاساں کی کہانی 'ہار' یا او ہنری کی ''بھائی کا تحفہ'' کو پڑھیں۔ آپ کہانی ایک بار پڑھنے کے بعد بھول نہیں سکتے۔ دونوں میں غریب انسان کی خواہشات، جذبات اور مجبوریوں کا تذکرہ ہے۔

''مختصر افسانے کی اپنی ایک دنیا ہوتی ہے اور اس کے لئے یہ ضروری بھی ہے کہ وہ اپنی ایک دنیا پیدا کرے۔ مختصر افسانے میں سب سے زیادہ جس چیز کو اہمیت حاصل ہے وہ تاثر کی وحدت ہے۔ مختصر افسانہ کسی ایک واحد مقصد کو سامنے رکھ کر تخلیق کیا جاتا ہے۔

عبادت بریلوی نے لکھا کہ یہ دور مختصر افسانے کا دور ہے کیونکہ آج کل کی

زندگی کے حالات اس فن سے مضابقت رکھتے ہیں۔ بدلتے ہوئے ماحول کی اور جن فنکاروں نے اس فن کو صحیح معنوں میں فن بنایا نئ تہذیب کی فلسفہ اور جمالیات سے دلچسپی رکھنے والا کسی حال میں بھی ان سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔

اردو کے سب سے پہلے افسانہ نگار پریم چند ہیں۔ سعادت حسن منٹو کا بھی ایک بڑا مقام ہے۔ اس کے علاوہ کرشن چندر، اشک، سہیل عظیم آبادی، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور، شکیلہ اختر وغیرہ بڑے نام ہیں۔

فریدہ عالم پروفیسر محسن صاحب کی بہو ہیں جنہوں نے ایک عظیم کہانی ''انوکھی مسکراہٹ'' کو جنم دیا۔ ہمارے روز کے واقعات ہمیں کہانی کے لئے مواد فراہم کرتے ہیں۔ فریدہ عالم بھی بتاتی ہیں کہ اُنکی کہانی کی بنیاد حقیقی کہانیوں پر ہے اور ان کے کرداروں کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

موصوفہ کی کہانی ''اگلے جنم مجھے عورت نہ کیجئیو''، عورتوں کی بے بسی کی تصویر پیش کرتی ہے جو زندہ درگور ہو کر بھی زندگی گذار دیتی ہیں اور کوئی قدم نہیں اُٹھا پاتی ہیں۔ گھر جمائی کی کہانی بھی ہمارے سماج کی ایک حقیقت کی عکاسی کرتی ہے۔ ''میاؔ'' کہانیٔ مجھے اپنی میا کی یاد دلاتی ہے جو شاید مجھے اپنی ماں سے زیادہ پیار کرتی تھی۔ ''ہرے ہرے نوٹ'' پیسوں کے لئے ہماری محبت کو بتاتی ہے جس کے سامنے انسانی رشتوں کی قدر نہیں ہوتی۔ ''چکلے والی کوٹھی'' ہمیں امید دلاتی ہے کہ ایک انسان جو مظلوم ہے اپنی محنت سے بڑا بن سکتا ہے۔ ''قاتل'' بھی ایک مظلوم عورت کی کہانی ہے۔ حسب نسب میں صوفیہ کی کہانی ہمیں یاد دلاتی ہے۔ ''خواب'' ہمیں بتاتی ہے کہ ایک باپ جس کی کئی بیٹیاں ہیں برسوں سے پریشانی کی زندگی گذارتا ہے۔ ''خودکشی'' انسان کی نفسیات کو بتاتی ہے جو انسانوں سے نفرت کرتا ہے اور جانوروں سے پیار۔ ''دو کشتی کے مسافر'' ہمارے سماج کے اس مسئلہ پر ہماری توجہ مبذول کراتی ہے جہاں

دو مذہب کے نوجوان شادی کر لیتے ہیں تو ان کو کس قدر پریشانیاں جھیلنی پڑتی ہیں۔

فریدہ عالم صاحبہ کی ایک اچھی کوشش ہے۔ انہوں نے سماجی مسائل کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے۔ موپاساں کی طرح انکی کہانیوں میں وہ بیان کیا جاتا ہے جو وہ دیکھتی ہیں۔ ان کہانیوں میں جو پیغام ہے اس پر ہمیں نظر رکھنی ہے۔

محمد احتشام کٹونوی

43، جگت اپارٹمنٹ

بینک روڈ، پٹنہ۔ ا

میری نظر میں

فریدہ عالم کے افسانوں کا مجموعہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ بہار کی خواتین افسانہ نگاری میں ایک نام کا اضافہ ہے۔ فریدہ کی شخصیت کے کئی پہلو سے میں واقف تھی جس میں وہ محنتی دھن کی پختہ اور محنت کرنے والی ہستی نظر آتی ہیں مگر مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ اُن کے اندر ایک افسانہ نگار بھی بیٹھا ہے۔ چلو یہ پردہ بھی اُٹھا!!

افسانوں کی خوبیوں اور خامیوں سے درگذر ان کی یہ کوشش اپنے آپ میں ایک بہت اہم بات ہے۔ خصوصی طور پر جب وہ خود اس بات کا اعتراف کرتی ہیں کہ ''افسانوں کا مجموعہ دو کشتی کے مسافر کو میں نے بہت شوق اور محنت سے تیار کیا ہے۔ اس کے سبھی افسانے صرف افسانے نہیں بلکہ ہماری زندگی کے تجربے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان کے اس مجموعہ میں زیادہ تر کہانیاں حقیقت کے گرد گھومتی ہیں۔ کمہا، گیلی مٹی اور اکا چاک سب حقیقت ہیں لیکن ایک ماہر فن اسکی شکل جو وجود میں لاتا ہے وہی اس کا ہُنر ہے۔

اُنکی کہانیوں میں ''کلجگی ماں'' اس میں ماں کے کردار کو جس انداز میں پیش

کیا گیا ہے اس سے ماں کی شخصیت، محبت اور ممتا پر بڑی کاری ضرب ہے اور اسی طرح ان کا افسانہ ''آخری فیصلہ'' ایک اچھا تاثر پیش کرتا ہے۔ اس میں باپ کی شفقت بہت ہی مثالی جذبہ کی حامل ہے۔ ساتھ ہی بہار کے پٹنہ اور اسکے نوائی علاقہ میں شادی بیاہ کی رسمیں اور اس موقع پر گائے جانے والے گیت، کپڑے جوڑے کی لفظی تصویر اچھی ہے۔ کچھ افسانوں میں توہمات کا تجربہ ملتا ہے۔ ممکن ہے یہ بھی تجربے کی ایک کڑی ہو۔

مختصر یہ کہ بیانیہ انداز میں یہ مجموعہ اچھا ہے۔ میں ان افسانوں کی قاری ہوں نقاد نہیں۔ یہ اُنکی پہلی کوشش ہے۔ دعا ہے اللہ کرے ہوز ور قلم اور بھی زیادہ

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی۔

پروفیسر [illegible]ودہ امام
سابق صدر شعبۂ اردو
رانچی ویمنس کالج

کچھ اپنے بارے میں

میں ایک پرانے خاندان کی فرد ہوں۔ جہاں ہمارے بچپن میں زبردست پردہ تھا۔عورتوں میں گھریلو تعلیم کا رواج تھا۔ خود ہماری امی نے گھریلو تعلیم حاصل کی تھی لیکن ان کی اردو ہندی اور انگلش کی بہت اچھی صلاحیت تھی۔ ہم لوگوں کا خاندان پٹنہ سیٹی کا پرانا خاندان تھا۔ جہاں عورتوں میں پردے کا سخت رواج تھا لیکن یہ دیکھ کر خوشی ہوتی تھی کہ ہماری دادی اماں جن کی پیائش تقریباً ۱۹۰۰ء کی تھی اور وہ بہراواں گاؤں کی رہنے ولی تھیں جہاں سخت پردے کے ساتھ عورتوں کی تعلیم کا کوئی رواج نہیں تھا۔ گھر میں استانی جی اردو پڑھاتی تھیں مذہبی تعلیم انہیں استانی جی کے ذریعہ حاصل کرتی تھیں۔ میری دادی اماں تو پڑھنے کی اس قدر شوقین تھیں ہم نے بچپن سے ان کو اردو کا اخبار یا ہندی سے پڑھتے دیکھا۔ رسالے ملتے تو اسے بھی پڑھ جاتیں۔ موٹے موٹے ناول لے کر پڑھتی تھیں۔ اسے اس قدر شوق سے پڑھتیں کہ ان کے چہرے کی رنگت بدل جاتی۔ دادی اماں کو دیکھ دیکھ کر مجھے بھی اخبار پڑھنے کا شوق ہو گیا اور اب اس کی عادت بن گئی ہے۔ اگر ایک دن اخبار نہیں ملتا تو مجھے زبردست کمی محسوس ہوتی اور بے چین ہو جاتی ہوں۔ ابھی ابھی میں دو تین اردو کے اور ایک دو انگلش کے اخبار پڑھتی ہوں۔

میں بچپن سے چھوٹی چھوٹی نظم، چھوٹی چھوٹی کہانیاں، لطیفے لکھنے لگی تھی۔ میرے ماموں جان (عثمان یوسف صاحب مرحوم) اور ان کے کچھ دوست جو اکثر ہمارے نانا (جناب یوسف صاحب مرحوم) کے یہاں صدر گلی پٹنہ سیٹی آتے تھے۔ جن میں ابراہیم بلخی صاحب مرحوم جن کو ہم لوگ نادم ماموں کہتے۔ (جناب خواجہ بدیع الزماں صاحب مرحوم) جن کو ہم لوگ بدیع ماموں کہتے سب ہماری ہمت افزائی کرتے تھے۔ (جناب وصی حیدر

جاوید مرحوم) جو ہمارے ماسٹر صاحب تھے انہوں نے ہمارے اس شوق کو پورا کرنے کے لئے کہا۔ ان سب بزرگوں کو اللہ جنت الفردوس میں جگہ دے (آمین) جن سے مجھے میرے ذوق کو پورا کرنے میں بہت مدد ملی تھی۔

اسکول کی پڑھائی کے بعد مجھے زیادہ تر رانچی میں رہنا پڑا۔ پڑھائی کی مصروفیت کی وجہ کر مجھے کچھ لکھنے کا موقع نہیں ملا۔ ۱۹۶۶ء سے سروس میں آنے کے بعد سروس کی ذمہ داری۔ گھر اور بچوں کی دیکھ بھال میں تو میں اس قدر مصروف ہوگئی اپنے اس ادبی ذوق کو دبا دینا پڑا۔

میرا یہ مجموعہ مختصر افسانوں کا ''دو کشتی کے مسافر'' کو میں نے بہت شوق اور محنت سے تیار کیا ہے۔ اس کے سبھی افسانے صرف افسانے نہیں ہیں بلکہ ہماری زندگی کے تجربے ہیں۔ یہ سب افسانے کچھ رشتہ داروں کی کچھ ملنے والوں کی کچھ دوستوں کی، کچھ آس پاس کی اور کچھ ان لوگوں کی جن کی زندگی کو ہم نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ایک کہانی بھی میرے دل کی گڑھی ہوئی نہیں ہیں۔ یہ مجموعہ آپ لوگوں کے سامنے ہے۔ قاری تو اصل جج ہوتے ہیں۔ امید ہے پسند کرنگے اور ہماری ہمت افزائی ہوگی۔ کچھ کہانیاں تو اخباروں میں بھی نکل چکی ہیں اور لوگوں نے پسند بھی کیا ہے اور اپنی پسند کا اظہار ان لوگوں نے فون سے کیا جن کا شکریہ ادا کر رہی ہوں۔

جن لوگوں نے ہمارے ادبی ذوق کو پورا کرنے میں میری مدد کی ان لوگوں کا ذکر کر رہی ہوں۔ ان سب لوگوں کا ذکر کرنا بہت ضروری ہے۔

سب سے پہلے تو میں اپنے دادا ابا (جناب یحیٰ صاحب مرحوم) دادی اماں مرحومہ (سلمٰی خاتون) کی شکر گذار ہوں جن کی کوششوں سے میرا داخلہ اسکول میں ہوا اور میں بی۔این۔آر۔ اسکول پٹنہ میں داخل ہوگئی۔ عام طور پر اس وقت ایک (۱۹۴۸ء سے) لڑکیوں کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ ہمارے دادا جان اور دادی جان تعلیم کے معاملے میں بہت روشن خیال تھیں اور ہمیشہ مجھے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے

کہتے تھے۔ میں بارہ سال کی عمر تک اپنے دادی حال منگل تالاب پٹنہ سیٹی میں رہی۔

ہمارے والد صاحب (جناب مناظر عالم صاحب مرحوم) کو وہ خود سائنس کے اسٹوڈینٹ تھے اور ایگریکلچرل کالج میں سروس میں تھے لیکن ان کا ادبی ذوق بہت اعلیٰ تھا۔ انہوں نے کافی مزاحیہ ڈرامے لکھے جو اگریکلچرل کالج کے اسٹیج پر کھیلے گئے اور کافی پسند بھی کئے گئے افسوس کی بات کے اسے شائع کرانے سے قبل کسی نے لے کر ادھر ادھر کر دیا۔ بڑے عہدے پر رہتے ہوئے ذمہ داریوں کو نبھاتے ہوئے بھی ان کو ادبی ذوق تھا۔

اسکول کی پرھائی کے سلسلے میں زیادہ تر پٹنہ سیٹی (صدر گلی) میں اپنے نانا ابا کے پاس رہی۔ ہمارے والد صاحب اپنی پڑھائی کے سلسلے میں باہر رہے اور تین سال امریکہ میں رہے۔ اس درمیان نانا ابا ہم لوگوں کے گارجین رہے اور انہیں کی گارجین شپ میں ہم سب بہن بھائیوں نے تعلیم حاصل کی۔ جب ہمارے والد صاحب کا تبادلہ مظفر پور ہو گیا تو ہمارے نانا ابا مظفر پور جا کر مجھے پٹنہ لے آئے اور میٹرک کا امتحان دلوایا۔

ہمارے چھوٹے ماموں جان (جناب عثمان یوسف صاحب مرحوم) جو بہت اچھے ادیب تھے۔ ان کی زندگی سے بھی میں بہت متاثر ہوئی ہوں۔ شادی کے بعد میں اپنے سسر (جناب پروفیسر محسن صاحب مرحوم) کی خواہش کے مطابق اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور ہم نے ایم.اے. اور پی.ایچ.ڈی. کیا لیکن اپنی تھیسس کی کتابی شکل نہیں دے سکی۔ اپنی مصروفیت کے بنا پر خدا معلوم میری زندگی میں یہ کام اب ہو سکے گا کہ نہیں۔ میں ۱۹۹۸ء اگست میں رٹائر ہو گئی ہوں لیکن خواہش کے باوجود بھی میں اپنی تھیسس کو کتابی شکل نہیں دے پائی ہوں خدا شاید پورا کر دے۔

میں اپنے تینوں بچوں کی بھی شکر گذار ہوں۔ ہماری بڑی بیٹی شکیبا جمیل نے ہمیشہ ہماری ہمت افزائی کی اور خاص طور پر ہمارے بڑے داماد ناصر جمیل رضوی نے

ہماری کہانیوں کو انٹرنیٹ پر دے کر دنیا کے دوسرے ملکوں میں رہنے والے رشتہ داروں تک پہنچا دیا۔ ہمارے بیٹے تابش محسن نے بھی کہانیوں کو انٹرنیٹ پر دیا اور دوسرے ملک تک اپنے رشتہ داروں کو پڑھنے کا موقع دیا۔ میری خواہش کے مطابق تابش نے اس مجموعے ''دو کشتی کے مسافر'' کا سرورق بنایا۔ ہماری بہو شگفتہ محسن نے بھی کہانیاں پڑھیں اور اپنی رائے مشورے دئے۔ ہماری چھوٹی بیٹی نشید عالم اس کے شوہر کوثر عالم نے بھی لیپ ٹوپ پر کہانیاں پڑھیں اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

میرے تینوں نواسوں، دانیال عالم، دارین عالم اور علی احمد رضوی نے بھی اپنی عمر کے مطابق تعریف کی اور کہانیاں سننے کی خواہش ظاہر کی۔ خاص طور پر دارین کو تو ہماری ایک ایک کہانی کا نام یاد ہے اور وہ اپنے خیال کا اظہار بھی کرتا ہے۔ بچوں میں میری اکلوتی نواسی علویہ جمیل اور اکلوتی پوتی کائنات محسن سب کو ہماری کہانیوں کو سننے میں خوب دلچسپی رہی اور اپنی عمر کے مطابق سب نے رائے مشورے بھی دئے۔ خدا سب کو خوش و تندرست رکھے (آمین)

جناب احتشام صاحب کٹونوی نے میری بہت مدد کی اور اپنی بہترین رائے دیتے رہے اور اس مجموعے کے لئے انہوں نے پیش لفظ بھی لکھ کر مجھ پر احسان کیا ہے۔ خدا ان کو تندرسی کے ساتھ سلامت رکھے (آمین) وہ خود بھی پڑھنے لکھنے میں کافی مصروف رہتے ہیں اس کے باوجود بھی انہوں نے میرے لئے وقت نکالا اس کے لئے ان کا بہت بہت شکریہ ادا کرتی ہوں۔ جناب احتشام صاحب کے بڑے بھائی جناب عمیر صاحب جو مستقل طور پر امریکہ میں رہتے ہیں لیکن جب وہ ہندوستان آئے تو ہماری رہائش گاہ گنگا ٹاور، پٹنہ آئے اور انہوں نے بھی ہمیں اپنا مجموعہ نکلوانے کا مشورہ دیا میں ان کی بھی شکر گذار ہوں۔

سب لوگوں نے میری کوششوں کو سراہا خاص طور پر بڑے بھائی قیصر عالم نے مجھے مجموعہ تیار کرنے کے لئے بار بار کہا۔ وہ خود بھی کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ ہماری

ممانی جان شمیم یوسف (اہلیہ جناب عثمان یوسف صاحب مرحوم) ہماری ساس کی چھوٹی بہن خالہ جان (صفیہ بی بی صاحبہ) نے بھی سب ہی افسانوں کو پڑھا اور اپنے خیال کا اظہار کیا۔ ہر افسانے میں انہوں نے خوبیاں بتائیں۔ ان بزرگوں کی دعائیں ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں۔

یہ سب کہانیاں آس پاس کے لوگوں کی کہانیاں ہیں جس نے مجھے متاثر کیا تھا۔ میں زندگی کے انتہائے وقت ابتدا کر رہی ہوں۔ ابھی ہماری عمر ستر سال ہو رہی ہے اور اب میں اس شوق کو پورا کر رہی ہوں۔ زندگی کی مصروفیت نے مجھے میرا شوق پورا کرنے کا موقع نہیں دیا۔ زندگی نے وفا کی تو انشاء اللہ اپنے تحقیقی مقالے کو بھی کتابی شکل دونگی۔ میری زندگی کی یہ حسرت تھی اس وقت میں اپنی زندگی کے تجربوں کو پیش کر رہی ہوں۔ خدا کرے میری کوشش قاری کو پسند ہو۔

ہماری کچھ کہانیاں پٹنہ اور رانچی کے اخباروں میں بھی شائع ہو چکی ہیں جیسے :۔

ہرے ہرے نوٹ	(قومی تنظیم، پٹنہ)
قلم روتا ہے	(پندار، پٹنہ)
ابا اماں بلا رہی ہیں	(قومی تنظیم، پٹنہ)
ہیرے کی بیسر	(قومی تنظیم، پٹنہ)
ماں کا آنچل	(پندار، پٹنہ)
دیکھ کبیرا رویا	(قومی تنظیم، پٹنہ)
بڑے گھر کا بیٹا	(پندار، پٹنہ)
کوٹھے والی چکلے والی	(قومی تنظیم، پٹنہ)
دور بہت دور	(قومی تنظیم، پٹنہ)
دو کشتی کے مسافر	(قومی حیثیم، پٹنہ)
پنچھی جگ جگ جائے	(پندار، پٹنہ)

میرا تحقیقی مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی۔ "شکیلہ اختر شخصیت اور ادبی خدمات ہے"۔ نگراں تھے سید ظہیر احسن صاحب صدر شعبہ اردو سچیتا نند سنہا کالج اورنگ آباد گیا جس پر مگدھ یونیورسٹی نے مجھے نومبر ۱۹۷۹ء پی۔ایچ۔ڈی۔کی ڈگری دیا۔

میں نے اپنا تحقیقی مقالہ مکمل کرنے کے لئے شکیلہ اختر صاحبہ کی سب کہانیوں اور ناولٹ کا بہت باریکی سے مطالعہ کیا۔اس سلسلے میں ہم نے دوسری خواتین افسانہ نگاروں کا بھی مطالعہ کیا۔سب کی کہانیوں میں ہم نے بناوٹ اور تصنع نہیں پایا اور اس چیز کو ہم نے اپنی زندگی میں ہی نہیں بلکہ اپنی کہانیوں میں بھی اپنایا۔

شکیلہ اختر کے علاوہ دوسری خواتین افسانہ نگاروں سے بھی میں بہت متاثر ہوئی ہوں جسے عصمت چغتائی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، واجدہ تبسم، صالحہ عابد حسین، جیلانی بانو، اعجاز شاہین، نصرت آرا۔ شمیم صادقہ وغیرہ میں اعلیٰ افسانہ نگاروں سے اپنا مقابلہ تو نہیں کرتی لیکن ان لوگوں کے افسانوں سے متاثر تو ضرور ہوئی ہوں۔

شکیلہ اختر بہار کی سب سے پہلی اور سب سے کامیاب افسانہ نگار رہی ہیں۔ افسانوی دنیا میں وہ پہلی صف میں کھڑی نظر آتی ہیں۔ میں اپنے تحقیقی مقالہ تیار کرنے کے سلسلے میں اکثر ان سے ملتی رہی ان کی باتوں کو ان کی صلاحیت سے متاثر ہوئی۔ گو یہ میرا تعلق ان سے ادبی ہی نہیں بلکہ رشتے کا بھی ہے۔ گو وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کی ادبی خدمات کو اردو ادب میں ہمیشہ یاد کیا جائیگا۔

ہمارے ماموں جان جناب عثمان یوسف صاحب مرحوم جو ادبی دنیا میں احمد یوسف کے نام سے جانے جاتے ہیں وہ بھی کئی کتابوں کے مصنف رہے ہیں۔ افسوس تو مجھے آج اس بات کا ہے کہ وہ آج دنیا میں نہیں رہیں ورنہ ہمارا مجموعہ نکلتے دیکھ وہ بہت خوش ہوتے۔ خیر ان کی روح کو ضرور خوشی ہوگی۔ خدا ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے ۔آمین۔ میں اور میرے شوہر شفیق محسن سرکاری نوکری میں تھے اور ہم لوگوں کے تبادلے ساتھ ساتھ بہار کے اکثر شہروں میں ہوئے۔ میں نے وہاں کے لوگوں کے طور طریقے کو

دیکھا۔ ان کی زندگی کا معائنہ کیا (اس وقت بہار اور جھارکھنڈ ساتھ تھا) میں نے ان لوگوں کی زندگی کو نزدیک سے دیکھا اور اسے اپنے افسانوں میں جگہ دیا۔

میرے کچھ افسانے قریب پیتالیس سال پرانے ہیں۔ میں نے نئی زندگی دی ہے۔ سرکاری نوکری اور گھر گرہستی کی وجہ کر میں اپنے قلم کا اتنے دنوں سے افسانوی دنیا سے دور کر دیا تھا پھر سے زندگی دے رہی ہوں۔

کئی سالوں تک میں لکھنے کی خواہش کو دبائے رہی اب ریٹائر ہونے کے بعد اس شوق کو پائے تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ خدا مجھے میرے مقصد میں کامیاب کرے (آمین)

میں ان سب لوگوں کی شکر گذار ہوں جن لوگوں نے میرے ان مختصر افسانوں کو پڑھا اور میری کوششوں کو سراہا اور مجھے ہمت دلائی کہ میں اس کو شائع کرسکوں۔ میں اپنے سسرال سے لے کر مائیکے تک کے ہر وہ فرد کی شکر گذار ہوں جن لوگوں نے میری ہمت افزائی کی ہے۔

زندگی کے آخری دور میں مجھے اپنے اس ذوق کو پورا کرنے کا موقع ملا ہے۔ اللہ میری محنت سوارت کرے۔ بزرگوں کے نام پر ہمارے خاندان میں اب صرف چار ہستیاں ہیں اللہ ان لوگوں کا سایہ قائم رکھے اور سب کی دعائیں ہم لوگوں کو ملتی رہیں (آمین)۔

میں نے اپنے بچوں سے کہہ دیا ہے کہ اگر میری زندگی میں میرا یہ افسانہ کا مجموعہ اتفاق سے نہیں تیار ہوسکا (چھپ سکا) تو تم لوگ اسے پائے تکمیل تک ضرور پہنچا دو گے۔ یہ میری دلی خواہش ہی نہیں بلکہ میری تمنا ہے میری وصیت ہے۔

اگلے جنم مجھے عورت نہ کیجیو

منورما ایک ہرفن مولا لڑکی تھی۔ خدا نے اس کو جیسی اچھی شکل صورت دیا تھا۔ اسی طرح دوسری خوبیاں بھی اس لڑکی میں بھر دی تھی۔ منورما کے والدین سے خوش ہوکر اللہ نے ایسی اولاد عطا کی تھی جس کو دیکھ کر لوگ خوش ہو جاتے۔ منورما کو اللہ نے ہر خوبیوں سے مالا مال کر دیا تھا۔ اس ہنس مکھ خوبصورت لڑکی کو ہر شخص پیار کرتا تھا۔ والدین کی دُلاری تو تھی ہی۔ منورما کی دوستوں نے اس کا نام آنند مئی رکھدیا تھا۔ وہ اس قدر ہنس مکھ تھی کہ کالج میں وہ آنند مئی کے نام سے مشہور ہوگئی تھی۔ منورما سب لوگوں کو خوش رکھتی تھی۔ وہ گھر کے بزرگ سے لے کر بچوں تک کی ہر دل عزیز تھی۔

اسکول اور پھر کالج کی پڑھائی مکمل کرتے کرتے منورما کی عمر بائیس سال ہو گئی اور پھر اس کی شادی کی باتیں ہونے لگیں اور پھر ایک دن اس کی شادی ایک آئی.اے.ایس.لڑکے سے ہوگئی۔ جو کافی اعلیٰ خاندان کا تھا لیکن شکل صورت بہت معمولی تھی۔ منورما بہت خوش تھی لڑکا آئی.اے.ایس.تھا یہ کیا کم خوشی کی بات تھی۔ سب لوگ بھی خوش تھے کہ گھر میں ایک بڑا افسر داماد بن کر آ گیا تھا۔ لیکن کچھ ہی دنوں میں منورما کو اپنے شوہر منوج کی کمزوریاں سامنے نظر آنے لگیں۔ دُلہن بن کر منورما نہایت حسین لگ رہی تھی جو دیکھ رہا تھا تعریف اور دُعاؤں کی بوچھار کر رہا تھا۔ کوئی حور اور کوئی پری۔ کوئی اپسرا کہہ رہا تھا۔ ان سب کے برعکس منوج کے پیشانی پر شکن تھے۔ سب لوگ منوج کا چہرا دیکھ رہے تھے۔ آخر انسان اتنی پیاری شکل دیکھ کر خوش کیوں نہیں ہو رہا ہے۔ منورما کا گورا رنگ اس پر کالے کالے لمبے بال جو چہرے پر آ جاتے تو ایسا لگتا جیسے چاند پر بادل آ گئے ہوں۔ کوئی بھی دیکھ کر تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ منوج کے دوست آتے اور منورما کی تعریف کرتے دیکھتے اور پھر بار بار تعریف

کرتے۔منوج کو اپنے دوستوں کی یہ بات بالکل پسند نہیں آتی۔منوج اپنے دوستوں کو اس قدر گھور کر دیکھتا جیسے وہ ان لوگوں کو پورا کا پورا نگل جائے گا۔دھیرے دھیرے منوج نے اپنے دوستوں کا آنا گھر میں بند کر دیا۔باہر سے باہر دوستوں سے بات کر کے روانہ کر دیتا اور لوگ تعجب کر کے چلے جاتے۔منوج منورما کو بہت لوگوں سے ملانا پسند نہیں کرتا۔پوری کوشش کرتا کہ منورما ان لوگوں کے پاس نہیں جائے۔جو لوگ اس کی خوبصورتی کی تعریف کرتے ہیں۔دوسروں کے منھ سے منورما کی تعریف سن کر منوج کو ایسا لگتا کہ وہ اس کی شکل کا مذاق اُڑا رہے ہیں کیونکہ منوج دیکھنے میں بہت ہی معمولی شکل صورت والا انسان تھا۔اس کا چہرا بن جاتا۔منوج کے آفس میں یا اس کے دوستوں، ملنے والوں یہاں منوج منورما کو لے کر کہیں نہیں جاتا۔اسے شک ہوتا کہ اس کے دوست منورما کی خوبصورتی کی تعریف اور اس کی بدصورتی کا مذاق اُڑائینگے۔منورما کی خوبصورتی کے ساتھ اس کے لمبے اور خوبصورت کالے بال کی بھی لوگ خوب تعریف کرتے۔منوج کی خواہش ہوتی کہ وہ منورما کے بال کتر دے اور آخر ایک دن موقع پا کر منوج نے منورما کے بال سوتے میں کتر دیئے۔جب منورما کو پتہ لگا تو وہ خوب خوب روئی۔منوج نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اُسے بڑے بال بالکل پسند نہیں۔منورما نے رو کر صبر کر لیا۔

منورما کو گانے، ستار بجانے، مصوری کرنے، کوتیا لکھنے میں خوب دلچسپی تھی لیکن شادی کے بعد ان سب باتوں کے لئے اس کے پاس وقت نہیں تھا کیونکہ منوج کو یہ سب بالکل پسند نہیں تھا۔ایک دن موقع ملتے ہی منورما ستار لے کر بیٹھی اور بجانا ہی شروع کیا تھا کہ منوج نے آ کر پریشان کر دیا۔کبھی پانی کی فرمائش اور کبھی چائے کی خواہش ظاہر کر کے اس کا سلسلہ ختم کر دیتا اور ایک دن تو موقع پا کر منوج نے اس کے ستار کے تار کو توڑ ڈالے۔یہ دیکھ کر منورما کو بہت تکلیف ہوئی۔اسے اچھے سے معلوم

ہو گیا تھا کہ یہ کام منوج کا ہے وہ اس کے شوق کو پورا ہونے نہیں دینا چاہتا۔

جب منور ما ہارمونیم لے کر گانے بیٹھی اور اسے خبر ہو گئی تو اس نے طبلے اور ہارمونیم کو توڑ ڈالا۔ گانے بجانے سے اس کو سخت نفرت تھی۔ دوسرے لوگ منور ما کے گانے کو بہت پسند کرتے لیکن منوج اس کے اس شوق کو پورا ہوتے دیکھ کر ناراض ہو جاتا۔ منور ما کو گانے، کویتا لکھنے، ستار بجانے اور مصوری میں کئی بار انعام مل چکے تھے۔ منور ما کی خوشیوں پر پہرہ بیٹھا کر منوج بہت خوش ہوتا۔ منور ما اس کی بیوی تھی اس کو شک کرنے کا اس کو پورا پورا حق تھا۔ ہر آنے جانے والے پر منوج پورا دھیان رکھتا بلکہ اس کے بھائی بھی اگر منور ما کو غور سے دیکھتے تو منوج کو اچھا نہیں لگتا اور وہ ان لوگوں سے بھی منور ما کو دور رکھنے کی پوری کوشش کرتا۔ منوج ایک نفسیاتی مریض کی طرح شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور سوچتا لوگ اس کی خوبصورت بیوی کو غور سے کیوں دیکھتے ہیں اسے جلن حسد محسوس ہوتی۔ ایک آئی.اے.ایس افسر کی اس طرح کی فطرت دیکھ کر منور ما کو بہت تعجب ہوتا۔

منور ما کی شادی کو چار سال ہو گئے تھے گھر میں کافی دائی نوکر تھے۔ منور ما کو گھر میں کچھ کام نہیں کرنا پڑتا لیکن منوج زبردستی اس سے کام کرواتا۔ اپنی غیر موجودگی میں بھی فون کر کے وہ منور ما کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتا۔

منور ما اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ والدین نے اس کے ہر شوق کو پورا کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی لیکن اس کے اُلٹا منوج کو یہ سب کچھ بالکل پسند نہیں تھا۔ اگر وہ منور ما کو گانا گاتے سن لیتا تو سخت ناراض ہو جاتا اور کہتا ''گانا بجانا مجھے پسند نہیں'' گھریلو عورت کی طرح گھر کے کام کرو۔ ساس سسر کی خدمت کرو۔ کوئی رنڈی کا کوٹھا نہیں ہے جہاں سے گانے بجانے کی آواز باہر آئے۔ منور ما کی ایک دو کویتا اخبار میں نکل گئی۔ جس میں ایک دبی کچلی عورت کے دُکھ کو دیکھایا تھا۔ منور ما کی صلاحیت

کے لوگ تعریف کر رہے تھے لیکن منوج نے منورما کے قلم تک کو توڑ ڈالا۔منورما کی کوتیا کی تعریف منوج کے ملنے والوں نے کیا۔جس سے اس کی ناراضگی اور بڑھ گئی۔

منوج نے منورما سے وعدہ کروایا کہ آگے سے وہ ہارمونیم،طلبہ،ستار کو ہاتھ نہیں لگائیگی۔منورما کو لگتا کہ سو سال کے انسان کی روح منوج کے جسم میں سما گئی ہے۔اس کی لکھی ہوئی کویتاؤں کو منوج پھاڑ ڈالتا۔

اس طرح کی بندشوں میں منورما کی شادی شدہ زندگی کو پندرہ سال گذر گئے۔وہ ایک قیدی کی سی زندگی گذار کر نیم پاگل سی ہوگئی تھی۔زندگی کے یہ پندرہ سالوں میں ایسے تلخ تجربے ہوئے تھے جسے وہ زندگی کے منحوس دن مانتی تھی۔وہ آزادی سے جینا چاہتی تھی جو یہاں ممکن نہیں تھا۔وہ بغیر گناہ کے سزا کاٹ رہی تھی۔ اگر کبھی کچھ بولتی تو منوج اس حد تک چلا جاتا کہ تھپڑ بھی لگا دیتا اور ایک دن تو حد ہو گئی۔منوج نے منورما کو یہاں تک کہہ دیا اپنے حسن پر گمان نہ کرو ورنہ چہرے پر تیزاب ڈلوا کر اس خوبصورتی کا خاتمہ کر سکتا ہوں۔منوج کی اس بات سے منورما کو سخت افسوس ہوا۔لوگوں کے سمجھانے بجھانے کا بھی منوج پر کوئی اثر نہیں ہوا اور دونوں کے درمیان دیوار حامل ہوگئی اور یہ دیوار وقت کے ساتھ اونچی ہوتی گئی اور پھر ایک دن ایسا آیا کہ منورما ہمت ہار گئی اور اس نے منوج سے الگ ہونے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے سسر ساس کے ساتھ اپنے والدین کو بھی خبر کر دیا اور اس نے طلاق کا فیصلہ کر کے اپنے والدین کے پاس آ گئی۔ایک نفسیاتی مریض کے ساتھ رہ کر منورما پاگل ہو چکی تھی۔ اسے ایسا لگتا تھا کہ کچھ دن اور یہی حالت رہیگی تو وہ بالکل پاگل ہو جائیگی۔

منوج نے ایک اچھی خاصی عورت کی زندگی برباد کر دیا تھا۔اپنے گھمنڈ اور عنا میں ایک اچھی خاصی لڑکی کی زندگی برباد کر کے رکھ دی تھی۔

اب منورما کی عمر قریب ستر سال کی ہو رہی ہے۔منوج سے الگ ہو کر منورما

نے زندگی بھر سکون محسوس کیا۔ والدین کے کہنے کے باوجود بھی منورما نے دوسری شادی نہیں کیا۔ اس نے ایک اسکول میں ٹیچر کی نوکری حاصل کر لی اور اپنے سب شوق۔ گانے۔ ستار بجانے کو تیا لکھنے اور مصوری کا شوق پورا کیا۔ اپنی کویتاؤں اور کہانیوں میں وہ دبی دبائی عورتوں کی تکلیف کو بیان کرتی اور اس طرح کی عورتوں کی پوری پوری مدد کرتی اور دل سے کہتی بھگوان اگلے جنم میں مجھے عورت نہ کیجیئو۔ کتنی عورتیں تو زندہ درگور ہو کر بھی زندگی گذار دیتی ہیں اور کوئی قدم اُٹھا نہیں پاتیں ہیں۔

گھر جمائی

سسرال کے گھر میں جم کر رہ جانے والے کو گھر جمائی کہتے ہیں۔ اگر کوئی داماد اپنے سسرال میں جم کر رہتا ہے تو وہ گھر جمائی کہلانے لگتا ہے۔ گھر جمائی کیا عزت سسرال میں ہوتی ہے اس کے بارے میں کسی شاعر نے کہا ہے

ساس کہتی ہے ایک کیلو چقندر لا دو
سالی کہتی ہے ریکھا کا کلنڈر لا دو

گھر جمائی کا نام آتے ہی ہنستی آجاتی ہے۔ شرفو بھائی پچھلے چھ ماہ سے گھر جمائی بنے ہوئے تھے۔ کرتے بھی کیا بیچارے ان کی اہلیہ گلناز بیگم والدین کی اکلوتی اولاد تھیں اور وہ اپنے والدین کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں اور شرفو بھائی اپنی اہلیہ کو چھوڑ نہیں سکتے تھے لہٰذا حالت مجبوری میں انہیں گھر جمائی بننے کی حامی بھرنی پڑتی تھی اور شرفو بھائی نے ہتھیار ڈال دیا۔

رشتہ داروں سے ملاقات ہوتی تو سب ان کا دل کھول کر مذاق اُڑاتے۔ بیچارے شرفو بھائی نیک اور شریف انسان سب کے مذاق برداشت کرتے۔

ایک دن رجو بھیا نے کہا ”کیوں شرفو بھائی آپ کو تو ان دنوں موج ہی موج

ہے۔ پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں ہے۔ سسرال میں تو صرف مرغے کی ٹانگ مل رہی ہوگی''۔ شرفو بھائی مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

ایک دن شرفو بھائی سوٹ بوٹ پہن کر اپنی اہلیہ کے ساتھ کہیں جانے کو تیار تھے کہ اسی وقت ان کے رشتہ دار دارین بھائی آ گئے اور کہنے لگے ''شرفو بھائی سسرال کا سوٹ ہے۔ خوب خوبصورت ہے۔ آپ کی پسند کا ہے یا سسر صاحب کی پسند کا ہے''۔ شرفو بھائی خاموش رہے۔ ان بن ملائے مہمانوں کو گھر سے ہٹانا مشکل تھا اور دوسری طرف ان کی اہلیہ غصے بھری آنکھوں سے شرفو بھائی کو گھور رہی تھیں وہ کیا کریں ان کو سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ آخر شرفو بھائی نے سب سے معافی مانگی اور سسرال کار سے اپنی اہلیہ کے ساتھ جانے لگے۔ جاتے جاتے دارین بھائی نے کہہ ہی دیا ''بیوی کے سامنے آپ کو ہتھیار تو رکھنا ہی پڑیگا۔ گھر جمائی جو ہیں۔ ان کی ہر بات ماننی پڑے گی۔ شرفو بھائی چُپ ہو گئے جیسے ان کو کوئی گالی دے رہا ہو گھر جمائی کا لقب ان کو اس قدر تکلیف دہ لگنے لگا تھا اس لفظ کو سن کر ہی وہ منھ بنا لیتے تھے۔

شرفو بھائی کی اہلیہ گلناز بیگم اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھیں۔ والدین نے ان کو بہت ناز نعمت سے پالا تھا۔ ہر خواہش کو پوری کیا جس میں ایک خواہش یہ بھی تھی کہ وہ والدین کو کسی قیمت پر چھوڑ کر کہیں نہیں جائیگی۔ سلیم صاحب نے اپنی بیٹی کی اس خواہش کو بھی شوق سے پورا کر دیا تھا۔ سلیم صاحب کے یہاں یہ گھر جمائی کا سلسلہ کئی پشت سے چلا آ رہا تھا۔ سلیم صاحب کے والد بھی ساری عمر گھر جمائی بن کر رہے چونکہ ان کے دونوں سالے پاکستان میں قیام پزیر ہو گئے تھے اس لئے وہ سسرال میں مشتقل طور پر رہنے کو مجبور ہو گئے۔ سلیم صاحب گھر جمائی بن گئے چونکہ ان کی ساس ہمیشہ بیمار رہتی اور خدمت کرنے کے لئے سلیم صاحب کی اہلیہ عطیہ بیگم والدین کے پاس رہ گیں۔ ان کی دونوں چھوٹی بہن سسرال چلی گئیں اور بھائی کوئی تھا نہیں۔ اب

تیسری پشت میں شرفو بھائی کو بھی گھر جمائی ہی بننا پڑا۔

شرفو بھائی آفس جاتے تو لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے۔ایک دن تو بوس نے پوچھ لیا شرفو صاحب ''سسرال کا کھانا تو آپ کو خوب لگ رہا ہے تندرست ہو گئے ہیں۔سسرال کا کھانا خوب اثر کر رہا ہے۔ہم لوگوں کو بھی کبھی کبھی سسرال کا کھانا کھلایا کریں۔ماشاءاللہ آپ کے گال بھر گئے ہیں اور چہرے پر رونق آ گئی ہے۔''

''جی سر جی سر'' کہہ کر شرفو صاحب خاموش ہو گئے۔قبل تو شرفو صاحب ٹفن لاتے تو سب مل جل کر کھاتے تھے۔اب شرفو صاحب کو کھانا کھانے کے لئے گھر جانا پڑتا تھا۔سسرال سے ملی موٹر سائیکل سے وہ کھانا کھانے گھر چلے جاتے اور واپس آتے تو لوگوں کا وہی ریمارک سننے کو ملتا'' کاش ہم لوگوں کی قسمت بھی ایسی ہوتی ہم لوگ تو بدنصیب رہ گئے'' موہن جی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

کسی کسی دن شام میں شرفو بھائی کے کچھ دوست آتے اور ان کو ہوٹل ساتھ چلنے کو کہتے لیکن بیچارے شرفو بھائی مجبور ہو جاتے اور اگر جانے سے انکار کر دیا تو دوسرے دن آفس میں ان کا دھجیاں اُڑ جاتیں۔

''ہاں ہاں بھائی شرفو آنچل سے بندھے ہوئے ہیں۔پیسے والی کے شوہر جو ہیں ہم لوگوں کا تو اب پتہ کٹ گیا ہے'' دارین بابو نے کہا۔جب ان کے ساتھ جانے کے لئے اُٹھتے تو شرفو بھائی شرماتے ہوئے کہتے'' ایسی کوئی بات نہیں اصل میں بیگم کی طبیعت ان دنوں ناساز ہے اس لئے میرا جانا ناممکن نہ ہوگا۔

احمد صاحب نے کہا'' بھائی جان کی طبیعت علیل ہے یا ساس سسر کے یہاں سے باہر جانے کی اجازت نہیں ملی۔گھر جمائی کو ساس سسر پالتو جانور کی طرح چین میں باندھ کر رکھنا چاہتے ہیں'' احمد صاحب تو بہت منھ پھٹے تھے، فراٹے سے بول گئے۔شرفو بھائی کو ان کی یہ بدتمیزی کی بولی بالکل اچھی نہیں لگی اور انہوں نے منھ بنالیا

تو احمد صاحب نے معافی مانگ لی۔ سوری کر کے گھر چلے گئے۔

شرفو بھائی یہ سوچ رہے تھے کہ دھیرے دھیرے لوگ سب بھول جائینگے لیکن ایسا نہیں ہو رہا تھا ایک تماشہ بن گیا تھا۔ آفس کے بڑے بابو نے ایک دن کہا "شرفو بابو ہمارا بڑا بیٹا جوان ہو گیا ہے۔ اس کے لئے بھی ایک موٹا آسامی کھوج دیں۔ میں بھی اسے گھر جمائی بنوا کر ذرا سکون کی سانس لوں۔

ایک چپراسی مدن نے بھی ٹو کا لگا دیا اگر میں کنوارا رہتا تو گھر جمائی بن جاتا کیا مزے ہوتے۔ آرام کا کھانا پینا اور بے فکری کی زندگی ہوتی۔

شرفو بابو کو لگتا انہوں نے کون سی منحوس گھڑی میں گھر جمائی بننے کو تیار ہو گئے ۔کاش میں انکار کر دیتا۔ ساس سسر کے سامنے شرفو بابو کی ایک نہ چلی۔ بیوی کی ناز برداریاں اُٹھانی پڑتی اِدھر تو ساس سسر کی ایک اور فرمائش شروع ہو گئی تھی کہ نوکری چھوڑ دو گھر میں کوئی کمی ہے جو تم کو نوکری کی ضرورت ہے۔ گو شرفو صاحب نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا اور اہلیہ کو یہ کہدیا کہ وہ کسی بھی قیمت میں نوکری نہیں چھوڑ سکتے ہیں بلکہ اس گھر کو چھوڑ دونگا۔ حالات کو دیکھتے ہوئے اس معاملے میں شرفو بابو کو پھر کسی نے کچھ نہیں کہا۔ پھٹے جوتے کی طرح سسرال والوں کی فرمائش بڑھتی جا رہی تھی۔ شرفو صاحب سخت پریشان رہتے اور کہتے۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھ ہوتا ہے کیا

گھر میں رہنے والے گھر جمائی شرفو بابو سب کے مذاق کا مرکز تو ضرور تھے لیکن پھر بھی وہ ہر بات کو کھیل کھیل میں اُڑا دیتے۔ کرتے بھی کیا سب کا سامنا کرنا اور سب کو جواب دینا ان کے لئے ممکن نہ تھا۔ رہے بیچارے سیدھے سادے آدمی تھے۔

بڑی حویلی

ہم سب بچّے بہت خوش تھے۔ پٹنہ شہر میں دادا جان نے ایک بڑی سی حویلی خرید لیا تھا جس میں نو عدد بڑے بڑے کمرے تھے۔ اونچا بڑا سا صحن باغیچہ میں مختلف پیڑ میں جھولے لگا کر ہم سب جھولتے بچوں کو تو چاندی ہو گئی۔ گرمی کی فرصت ہو گئی اور سب بچے ایک جگہ جمع ہو گئے۔ یوں تو خود اپنے گھر میں ماشاءاللہ کافی بچّے تھے۔ گرمی کی فرصت کی وجہ کر رشتے داروں کے بھی کچھ بچے آ گئے تھے۔ پوری حویلی بھری ہوئی تھی۔ اتفاق سے بہت دنوں کی کوشش کے بعد دادا جان کو یہ حویلی ملی تھی اور دادا جان نے اسے فوراً خرید لیا۔ لوگوں نے بتایا کہ حویلی کئی سالوں سے بند تھی۔ طرح طرح کی باتیں سننے کو ملتی تھیں کہ اس کا مالک کون تھا اور کیوں اتنے دنوں سے بند تھی۔ دادا جان کو فضول باتوں سے کوئی مطلب تو تھا نہیں۔ اس لئے سودا ہو گیا اور دادا جان نے اس طرح حویلی کو خرید لیا۔

سب سامان گاؤں سے آ گیا اور سب جگہ سیٹ کر دیا گیا۔ دائی نوکر بھی بہت خوش تھے ان لوگوں کو الگ الگ کوٹھری مل گئی تھی۔ باورچن بوا بھی بہت خوش تھیں۔ بڑا سا باورچی خانہ جو مل گیا تھا۔ دادا جان تو خیر بہت ہی خوش تھے ان کو روزانہ بگھی پر بیٹھ کر کورٹ آنا نہیں پڑیگا۔ نہ تھکاوٹ رہے گی اور نہ وقت کی بربادی ہوگی۔

نل کا پانی آسانی سے مل جائیگا اور ہاتھ کے پنکھے سے نجات مل گئی۔ اس لئے نوکر دائی سب خوش تھے اور اس کا اظہار ان لوگ بار بار کر رہے تھے۔

ایک عجیب بات تھی اس بڑی حویلی میں ایک کونے میں ایک قبر نما چیز تھی۔

محلے والوں نے دادا جان کو بتایا کہ آج تک یہ پتہ نہیں چلا کہ یہ قبر ہے سمادھی ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کسی سادھو نے سمادھی لی تھی۔ یہاں اور یہ سمادھی ہے اور کچھ لوگ اس نے برخلاف کہے تھے کہ کسی بزرگ کی قبر تھی لیکن دادا جان نے جن سے حویلی خریدا تھا ان لوگوں نے دادا جان سے کہا تھا کہ قبر ہو یا سمادھی لیکن اس کی صفائی کرانا اور خوشبو چھیٹنا اگربتی جلوانا آپ لوگ کبھی مت بھولینگے لیکن ہمارے دادا جان تھے پورے وہابی ان سب باتوں پر بالکل دھیان نہیں دیا اور اسی حالت میں سب لوگ رہنے لگے۔

اتنے کم دام میں اتنی بڑی حویلی مل گئی تھی اس بات میں سب خوش تھے اور ہم بچے کھیل کود میں مگن تھے۔ اتنے پیڑ اور طرح طرح کے پھل تھے۔ گرمی کے دن تھے لیچی اور آم فالسہ، امرود، توڑ توڑ کر کھانے میں خوب مزا آ رہا تھا۔ ایک رات عجیب بات ہوئی۔ ہمارا چھوٹا بھائی ڈبو آدھی رات میں چلانے لگا کہ ہماری پلنگ کسی نے آسمان میں اُچھال دیا ہے۔ اسے سب لوگوں نے سمجھا بُجھا کر سلا دیا کہ شاید تم نے خواب دیکھا ہوگا۔ وہ خاموشی سے سو گیا۔ لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ ہماری بڑی باجی محرم کے ڈھول کی آواز سن کر چھت پر تماشہ دیکھنے چڑھ گئیں اور اوپر سے اس طرح گر گئیں۔ دو ماہ کے لئے پیر میں پلاسٹر لگوانا پڑا۔ کبھی کبھی ہنسنے اور رونے کی آواز آتی لیکن دادا جان وہم کر کے ٹال مٹول کر دیتے۔

ایک دن ایک بوا چلاتی ہوئی آئیں کہ ایک عورت ہاتھ میں لالٹین لے کر آئی اور صحن میں اس نے لالٹین کو ٹیک دیا اور پھر غائب ہوگئی۔ اگر ان لوگ ٹوٹی لالٹین لا کر نہیں دیکھاتے تو کسی کو یقین نہیں آتا پھر یہ بوا کام چھوڑ کر چلی گئیں۔

دو تین دن گذر گئے۔ رات میں ہم لوگوں کا بستر آنگن میں لگایا گیا۔ گرمی

بہت تھی پوری چاندنی رات تھی۔ سب لوگ گہری نیند میں سوئے ہوئے تھے کہ چھوٹی چچی رات کے دو بجے اُٹھ کر چلانے لگیں کہ کوئی عورت ان کے سرہانے آ کر بیٹھ گئی اور ان کے بچے راجو کی طرف اشارہ کر کے اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لئے کہہ رہی تھی۔ چھوٹی چچی کے چلانے پر سب لوگ اُٹھ گئے اور پھر سب نے ان کو سمجھا دیا کہ ہو سکتا ہے وہم ہو۔ ہو سکتا ہے کہہ کر چھوٹی چچی سو گئیں۔

دوسرے دن ہم لوگ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے کہ دیوار میں لگی ایک سوئی مجھے چُبھ گئی اور میں چلانے لگی۔ دیکھا گیا تو بہت ساری سوئیاں اِدھر اُدھر دیوار میں لگی تھیں ہم لوگوں نے ساری سوئیاں نکال کر پھینک دی۔ ہم لوگوں کو تو اس سے کوئی مطلب ہی نہیں تھا کہ کیوں لگائی گئی ہے۔

ایک رات کوٹھے پر چھت کوٹنے کی آواز آنے لگی۔ رات میں کسی کی ہمت اوپر جانے کی تو تھی نہیں۔ صبح کو جا کر دیکھا گیا تو اینٹ کا پاوڈر رکھا تھا۔ اینٹ اوپر کہاں سے آئی۔ کسی نے اسے بیسا کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کبھی کبھی تو پکا ہوا کھانا برتن کے ساتھ باورچی خانے سے غائب ہو جاتا۔

دادا جان نے اس بات کو بھی اہمیت نہیں دیا اور خاموش ہو گئے اور پریشانی کا یہ سلسلہ قائم رہا۔ ایک رات ہم لوگوں کا پرانا نوکر سلیم دوڑا ہوا آیا اور دادا جان کے پیر پکڑ لیا۔ حضور میرا حساب کر دیں ہم اب نہیں رہ سکتے ہیں۔ اس نے بتانا شروع کیا کہ ''ایک فقیر جیسا سا آدمی پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے آدھی رات کو ہماری کوٹھری کے آگے کھڑا تھا۔ سب کھڑکی دروازے بند تے۔ صدر دروازہ بھی۔ پتہ نہیں وہ کہاں سے آ گیا۔ ہزار سمجھانے پر بھی وہ رکنے کو تیار نہیں ہوا اور اپنے گھر چلا گیا۔ ان حالات

کو دیکھتے ہوئے بواؤں اور نوکروں میں بے چینی دیکھی گئی اور اس طرح کھلائی ایک بوا اور ایک عدد نوکر بڑے میاں بھی کام چھوڑ کر چلے گئے۔ گھر کی عورتیں پریشان حال ہو گئیں۔ سمجھانے بجھانے پر صرف ایک عدد نوکر اور ایک بوا کسی طرح رُک گئیں۔ حالانکہ سب کو گھبراہٹ تھی کہ کب وہ لوگ اپنا بستر باندھ لینگی۔ دادی جان سے لے کر باجی جان تک سب پریشان تھیں۔ ہم سب بچوں کو بھی گھر کی عورتوں کی محنت دیکھ افسوس ہوتا۔ سب لوگ گاؤں کا وہ امن چین یاد کرتے۔ پر اس طرح کی آزادی اور باغ باغیچہ کی کشش اپنی جگہ تھی جو ہم لوگوں کے لئے تھی۔

دو ماہ اسی طرح گذر گئے کہ اچانک غم کی ایسی زبردست آندھی آئی کہ ہم لوگوں پر عافتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بڑے چچا کا چودہ سال کا بیٹا دو روز کی بیماری میں انتقال کر گیا۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ ماحول اس قدر خراب ہو گیا۔ ابھی اس غم سے تازہ تھے کہ چھوٹی پھوپھی جو ولادت کے لئے آرہ سے آئی ہوئی تھیں۔ ان کے یہاں گھر میں بھی ایک بیٹا ہوا لیکن اس کی شکل بہت ہی خطرناک تھی اور پورے جسم کی کھال اتری ہوئی تھی۔ جس نے دیکھا تعجب میں پڑ گیا کہ آج تک ایسا بچہ کسی نے نہیں دیکھا تھا۔

بقیہ ایک اور حادثہ ہو گیا۔ منجھلے چچا کا بارہ سال کا بیٹا ایک دو دست ہوتے ہی بے ہوش ہو گیا اور ڈاکٹر کے یہاں جانے سے قبل اس نے دم توڑ دیا۔ دادا جان حکم خداوندی مان کر خاموش ہو گئے لیکن ہر فرد پریشان تھا اور ناراض بھی تھا مگر حکم خداوندی کے ساتھ حکم دادا جان کے سب لوگ خاموشی سے غم کو برداشت کر رہے تھے۔

چھوٹے بچے ڈرے سہمے رہنے لگے۔ سب کی ماؤں نے زبردست پہرے داری کر دی۔ سب لوگ چوکنا رہتے۔ دعائیں پڑھی جائیں مگر کسی مولوی ملا سے جھاڑ

پھوک کے حق میں دادا جان نہیں تھے۔ جھاڑ پھوک کی تصور پر تو دادا جان کو تو بالکل یقین تھا ہی نہیں۔ چھوٹی پھوپھی جان کی شادی کچھ دن قبل ہوئی تھی ان کے شوہر آئے ہوئے تھے۔ اچانک اُن کو پاگل پن کا دورہ ہو گیا۔

دادا جان کے ساتھ بھی ایک ایسا حادثہ پیش آیا کہ ان کو مجبور کر دیا۔ ایک دن وہ باغیچے میں اپنے فرش پر حقے کے کش لگا رہے تھے کہ اچانک حقے کا پانی ان کی سانس کی نلی میں چلا گیا اور پھر ان کی حالت اتنی خراب ہو گئی کہ حکیم اور ڈاکٹر کسی نے انہیں ٹھیک نہیں کیا اور کئی دنوں علاج کے بعد بھی ان کی بولنے کی طاقت ختم ہو گئی۔ کوشش کے بعد بھی وہ بول نہیں سکتے تھے۔ کان اور آنکھ سے ٹھیک تھے لیکن وہ اپنے اشارے سے سب سمجھانے کی کوشش کرتے اور آنکھوں سے آنسو بہہ جاتے۔

اب گھر کے ہر فرد نے طئے کر لیا کہ وہ اب اس حویلی میں کسی قیمت میں نہیں رہینگے۔ سب نے اپنا اپنا ٹھکانہ ڈھونڈ لیا۔ سب کا کہنا تھا کہ ایک جگہ نہیں تو الگ الگ رہینگے۔ کم از کم سکون سے تو رہیں گے۔ سامان کو باہر جاتے ہوئے دادا جان دیکھ رہے تھے اور خاموش تھے۔ زبان نے تو ساتھ دینا چھوڑ ہی دیا تھا ان کی مجبوری دیکھ دیکھ کر سب لوگ افسوس بھی کر رہے تھے۔ بڑے چچا کے ساتھ دادا جان دادی جان چلے گے۔ حویلی بالکل خالی ہو گئی۔ دادا جان دو تین سال زندہ رہے لیکن آواز واپس نہیں آئی۔ خدا معلوم کیا بات تھی اور کیا معاملہ تھا یہ تو بڑے لوگ بھی سمجھ نہیں پائے، لیکن وہ دن اور وہ راتیں یاد کر کے آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

قریب قریب پچاس سالوں کے بعد میں اس محلے میں گئی تو مجھے بہت تعجب ہوا کہ وہ عمارت وہاں سے غائب تھی اس کی جگہ کھلا میدان تھا۔ میں نے محلے والوں سے پوچھا تو انہوں نے کہا۔ آپ لوگوں کے بعد دو چار خاندان اور آئے لیکن سب

کے ساتھ پریشانیوں کا سلسلہ اسی طرح رہا اور سب چھوڑتے گئے۔ تیس سالوں سے حویلی بند تھی اور اس کے سب حصے دھیرے دھیرے گرنے لگے تھے۔ آخر میں حویلی کے مالک نے اسے پورے طور پر توڑوادیا اور کھیت کے طور پر استعمال کرنے کے لئے کسانوں کے حوالے کر دیا لیکن جس نے بھی وہاں کھیتی کرنی چاہی سب پریشان رہے ۔کبھی جانوروں نے فصل برباد کر دیا کبھی بجلی گرنے سے آگ لگ گئی اور کبھی کیڑے لگ گئے اور فصل برباد ہوگئی۔ محلے کے دوسرے شخص نے بتایا برسوں سے یہ کھیت کے طور پر بھی استعمال نہیں ہوا ہے۔ محلے کے لوگ یہاں بیٹھ کر گپیں کرتے ہیں۔ حالانکہ اندھیرا ہونے کے بعد یہاں پر کوئی رُکنا نہیں چاہتا۔ ایک شخص نے تو اپنی بیٹی کی شادی میں یہاں شامیانہ لگوادیا تو اس میں ہی آگ لگ گئی۔ جان کی تو نہیں مگر مال کی بہت بربادی ہوئی۔ بچے کھیلنے آتے ہیں تو ان لوگو کے جھگڑے ہو جاتے ہیں یا ہاتھ پیر ٹوٹ جاتا ہے۔ اس لئے بچے بھی اس میدان میں نہیں کھیلتے۔ قبر تھی وہ کہیں نظر نہیں آئی شاید وہ دھنس گئی ہوگی۔ خدا جانتا ہے کہ کون سی طاقت تھی جو لوگوں کو صرف پریشان کرتی تھی ۔کون سے جین روح تھی جسے کسی کی خوشی دیکھی نہیں جاتی تھی۔

بڑے گھر کا بیٹا

آج رومی کو زبردست فالج کا جھٹکا لگا ہے۔ اسے بے ہوشی کی حالت میں کچھ لوگ ٹیمپو پر لے کر گھر چھوڑ گئے۔ نیلم اس کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئی اور اس نے فوراً اسپتال میں امبولنس کے لئے فون کیا اور پھر امبولنس سے اسے لے کر اسپتال آ گئی۔ کون لوگ رومی کو لے کر آئے تھے نیلم ان لوگوں کو پہچان بھی نہیں سکی ان لوگوں نے ٹیمپو کا کرایہ نیلم سے دلوایا۔ نیلم کو رومی کی بڑی بڑی باتیں اور گھمنڈ کی باتیں یاد آرہی تھیں۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ اس انسان کو اس حالت میں اسپتال میں چھوڑ کر چلی

جائے لیکن تیس سالوں کا ساتھ اور انسانیت کے ناطے وہ ایسا نہ کر سکی۔

رومی بے سودھ رہا۔ آئی۔ سی۔ یو۔ میں پڑا تھا۔ نیلم گھر گئی اور پیسے لے کر آئی ڈاکٹروں سے بات کی اور بہتر علاج کے لئے کہا۔ نیلم کی شادی کو تیس سال ہو چکے تھے۔ شروع میں نیلم کے ساتھ رومی کا رویہ ٹھیک ہی رہا لیکن چند سال گذرنے کے بعد اس میں تبدیلی آنے لگی اور پھر بعد میں اس میں زبردستی تبدیلی آنے لگی اور آہستہ آہستہ اس کی عجیب حالت ہوگئی۔ رومی ایک بڑے گھر کا بیٹا ضرور تھا لیکن دھیرے دھیرے اس کی حرکتوں کا پتہ لگنے لگا کہ وہ کس قدر نیچ تھا۔ رومی کی حرکتوں اور اس کی غیر ذمہ دارانہ حرکت سے نیلم سخت پریشان رہتی تھیں۔ شادی کے فوراً بعد نیلم کو ایک آفس میں کللرک کی نوکری مل گئی اور وہ گھر کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ آفس کی ذمہ داری بھی نبھانے لگی۔ رومی کو نیلم نے سمجھا سمجھا کر سدھارنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن سب بیکار ثابت ہوا۔ رومی ایک آزادانہ زندگی گذارنے کا عادی تھا اور اپنی نفسیاتی خواہشوں کو پوری کر رہا تھا۔ اپنی اس حالت کا ذمہ دار وہ خود تھا۔ دس دنوں سے رومی زندگی اور موت کے بیچ جنگ لڑ رہا تھا۔ نیلم پیسے کا انتظام کرتی اور ساتھ تیمارداری بھی۔ اس درمیان کچھ رشتہ دار ضرور آئے لیکن تھوڑی دیر ٹھہر کر نیلم کو سمجھا کر دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے چلے جاتے۔ نیلم کے ساتھی اس کی تقویت کرتے اور آتے جاتے رہتے تھے۔ نیلم کا دل رومی کی طرف سے ٹوٹ گیا تھا لیکن اس وقت رومی کے علاج کی ضرورت تھی وہ سب کچھ بھول کر اسپتال میں رہ رہی تھی۔

نیلم میری بہت پیاری دوست ہے۔ میں نے اس کی زندگی کو بہت نزدیک سے دیکھا تھا۔ تیس سالوں سے اس کی زندگی کو نزدیک سے دیکھ رہی تھی جسے رومی نے جہنم بنا دیا تھا۔ ایک اچھے گھر کا ایسا گرا ہوا انسان بہت کم ہوتا ہے۔

رومی نے نیلم کو ذلیل کرنے کی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ رومی کو دوسری عورتوں سے اس قدر الفت تھی اپنے گھر کو وہ کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ محلے کی کوئی خوبصورت عورت ہو تو رومی اس کا ہمدرد بن جاتا، کہیں کوئی پیاری شکل نظر آتی وہ اس کی خاطر مدارات میں لگ جاتا اور اپنی اس حرکت میں وہ نہ عمر کے بارے میں سوچتا اور نہ اپنے خاندان کا خیال کرتا اور نہ اپنی عمر کا لحاظ رہتا۔ کوئی لڑکی اس کے گھر آجاتی تو بھی وہ آگے پیچھے کرنے لگتا۔ نیلم نے تو اس کی الماری میں کئی خوبصورت اور جوان عورتوں اور لڑکیوں کی تصویر دیکھی تھی اسے دیکھ کر بہت افسوس ہوتا لیکن دل مسوس کر رہ جاتی۔

اگر نیلم بیمار پڑ جاتی ساری رات تکلیف میں گذرتی تو بھی رومی پر کوئی اثر نہیں ہوتا لیکن اگر محلے کی کوئی خوبصورت اور جوان عورت بیمار پڑتی تو رومی اس کی عیادت میں بار بار جاتا۔ نیلم کو ان سب باتوں سے بہت تکلیف ہوتی اسی طرح شادی کے پچیس سال گذر گئے۔ نیلم کی دونوں جایاں لڑکیاں بیس سال کی ہوگئیں۔ نیلم نے ان لوگوں کی شادی بھی اپنی سہیلی کے دو بیٹوں سے کر دی۔ لڑکیوں کے جانے کے بعد نیلم اور اکیلی ہوگئی۔ رومی نے پیسے خرچ کئے اور نہ لڑکیوں کے جانے کا اس پر کوئی اثر ہوا۔ سب کچھ نیلم نے خوشی خوشی انجام دیا۔

جب نیلم کو رومی سے مدد کی ضرورت تھی تو رومی اِدھر اُدھر بھٹک رہا تھا۔ دل بہلا رہا تھا۔ کچھ جملے تو ایسے سناتا کہ نیلم رو رو کر رہ جاتی۔ سمجھانے کی کوشش کرتی تو رومی کہتا۔

”جب کھانا باسی ہو جاتا ہے تو اسے کوڑے دان میں ڈال دیا جاتا ہے۔ جب کپڑے پرانے ہو جاتے ہیں تو اترن سمجھ کر اسے کسی کو دے دیا جاتا ہے لیکن جب بیوی پرانی ہو جاتی ہے تو نہ اسے کوڑے میں ڈالا جا سکتا ہے اور نہ اترن کی طرح سے

کسی کو دیا جا سکتا ہے۔ سوائے دل کو بہلانے کا انتظام کسی اور سے کیا جائے۔ جب پیسے خرچ کر کے میرا دل بہل جاتا ہے تو کسی کو کیا پریشانی ہے میں تو دوسری عورتوں کے حسن سے دل بہلاتا ہوں اور اسی کے لئے پیدا ہوا ہوں میں اپنی کمائی خرچ کرتا ہوں کسی کو کیا پریشانی ہو سکتی ہے۔''

نیلم کو یہ جملے تیر کی طرح لگتے لیکن وہ سننے پر مجبور تھی ایک شریف گھرانے کی عورت اور کر بھی کیا سکتی ہے۔ یوں تو نیلم نے کئی بار طلاق کے بارے میں ارادہ بھی کر لیا لیکن اپنے خاندان اور سسرال والوں کی خیال کر کے خاموش ہو جاتی۔

نیلم رومی کی حرکتوں کی وجہ کر اس سے دور دور رہنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتی۔ رومی کو بھی گھر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ صبح سے نکل کر رات میں گھر آتا اور سرائے کی طرح سو جاتا۔ اِدھر اُدھر سے رومی کی سرگرمیوں کی خبر نیلم کو ہو جاتی اور وہ دل مسوس کر رہ جاتی کس طرح پیسے اڑا رہا ہے سب باتوں کی خبر نیلم کو ہو جاتی۔ دوسری عورتوں کے لئے رومی طرح طرح کے تحفے خریدتا۔ پیسے خرچ کرتا لیکن اپنی بیوی کے لئے ایک رومال بھی نہیں لاتا۔ ابتک کوئی عورت نے کوئی رومی کی پسندیدہ ہستی نے رومی کو دیکھنے کے لئے قدم نہیں رکھا تھا۔ علاج سے رومی بہتر ہونے لگا تھا۔ دو ماہ میں رومی بیساکھی لے کر چلنے کے لائق تو ضرور ہو گیا لیکن اس کا ایک پیر ہمیشہ کے لئے خراب ہو چکا تھا۔ ٹھیک ہونے کے بعد رومی کا ایک پیر اور ایک ہاتھ پوری طرح سے بیکار ہو چکا تھا۔ بیساکھی کی مدد سے بھی وہ اچھی طرح کھڑا نہیں ہو پا رہا تھا۔ رومی کے آنکھوں میں آنسو آ جاتے اور وہ نیلم سے آنکھیں نہیں ملا پا رہا تھا۔ آخر اسپتال سے فرصت ملنے کے بعد رومی نے نیلم کا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنی شرمندگی کا ذکر کیا اور بولا۔

''نیلم مجھے تو بھگوان نے بہت بڑی سزا دیا ہے۔ میں تو تم سے معافی مانگنے

کے لائق بھی نہیں ہوں۔ میں نے ابتک تمہارے اور بچیوں کے لئے کچھ نہیں کر سکا۔ لڑکیوں کے لئے میں بر بھی نہیں ڈھونڈ سکا۔ میری وجہہ سے نیلم تمہیں بہت پریشانی اُٹھانی پڑی ہے بھگوان کے لئے مجھے معاف کردو۔ ہماری وجہہ کر تمہاری ذمہ داریاں بہت بڑھ گئیں''۔

گھر آکر رومی نے اپنی الماری سے وہ ساری عورتوں کی تصویریں نکال کر اور وہ حسینوں کے خطوط آگ کے حوالے کر دیا۔

رومی پوجا پاٹ تو کرتا تھا لیکن اب وہ ایک اچھا اور سچا پجاری بن گیا تھا بھگوان کے سامنے بیٹھ کر وہ بھگوان سے معافی مانگتا اب نہ اس کے پاس پیسے تھے اور نہ تندرستی اور نہ حسین عورتوں کا ساتھ۔

نیلم دل میں سوچتی جب انسان ہر طرح سے مجبور ہو جاتا ہے تو وہ جوٹھے کھانے اور اترن کپڑے سے بھی گئی گذری عورت کے سامنے بھی ہتھیار ڈال دیتا ہے۔رومی کا ایک پیر اور ایک ہاتھ بالکل برباد ہو چکا تھا اور بولی بھی صاف نہیں تھی۔

رومی گڑگڑا کر نیلم سے کہا ''نیلم میں بالکل مجبور اور کنگال ہو گیا۔ بھگوان کے لئے مجھے سہارا دو اور میں بالکل اکیلا ہوں۔''

نیلم تیس سالوں سے اس کی حرکتوں سے عاجز تو ضرور تھی لیکن اپنا ایک فرض ایک مجبور انسان کے لئے پورا کر رہی تھی جو بڑے گھر کا بیٹھا تھا۔

نیلم کو رومی کی باتیں یاد آتیں تو اس کا دل اس کی طرف دیکھنے کا نہیں کرتا۔

جب مغرور انسان کے بدن میں طاقت اور جیب میں پیسے رہتے ہیں تو وہ اپنے کو شیر سے بھی زیادہ طاقت ور سمجھتا ہے لیکن جب یہ دونوں چیزیں نہیں رہتیں تو وہ چوہے سے بھی زیادہ کمزور ہو جاتا ہے اور اپنی اصلیت سمجھ میں آجاتی ہے۔

ماں کا آنچل

اب سے قریب پچاس پچپن سالوں قبل میں بہت چھوٹی تھی۔ ہمارا پورا خاندان کلکتہ ایک شادی کی تقریب میں جارہا تھا۔ رشتہ بہت نزدیک کا تھا اس لئے ہم سب لوگ جانے کو تیار ہو گئے تھے۔ ہم سب بچے بھی بہت خوش تھے۔ نئے کپڑے چپل جوتے اور پھر نئی جگہ گھومنے کا شوق ہم سب کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ ہم سب لوگ جانے کی تیاری میں لگے ہوئے تھے۔ پھر وہ خوشی کا دن آ گیا ہم سب لوگ اسٹیشن جانے کیلئے تیار ہو گئے۔ ہم لوگ کے قافلے کے ساتھ تین عدد بوائیں بھی جا رہی تھیں۔ ہم سب کا قافلہ کافی سامانوں کے ساتھ اسٹیشن پہنچ گیا۔ ٹرین میں ابھی دیر تھی ہم سب پلیٹ فارم پر دوڑ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ٹرین آ گئی اور ہم سب لوگ ٹرین پر چڑھ گئے۔ ہم لوگوں کی خوشی اور بھی بڑھ گئی۔ گاڑی کھلی اور ہم لوگ ہر اسٹیشن کا نام پڑھتے آپس میں باتیں کرتے اور پھر ہم سب لوگوں کو رات کا کھانا ملا۔ کھا کر ہم لوگ سو گئے۔ نیند تو کیا خاک آئیگی کلکتہ کے بارے میں سوچتے رہے اور پھر کروٹ بدلتے بدلتے ہی صبح ہو گئی۔

ہم سب لوگ صبح کلکتہ پہنچ گئے۔ کئی گاڑیاں ہم لوگوں کو لینے کے لئے اسٹیشن آئی تھی اور ساتھ میں کئی رشتہ دار بھی۔ سلام و دعا کے بعد ہم لوگوں کا یہ قافلہ کئی گاڑیوں میں بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں ہم لوگوں نے بس پر بس اور ٹرام دیکھا عجیب سا لگا۔ پھر ہم لوگ نانا جان (صاحب خانہ) کے یہاں پہنچ گئے۔ بڑی سی کوٹھی خوبصورت سجاوٹ کے ساتھ اس طرح کی کوٹھی ہم بچوں نے قبل کبھی نہیں دیکھی تھی۔ تیار ہو کر ہم سب لوگ پوری کوٹھی میں گھومنے لگے اور رشتہ دار بھی آئے ہوئے تھے۔ ہم لوگوں کی خوب آؤ بھگت ہو رہی تھی۔ طرح طرح کے کھانے۔ کوئی روک ٹوک نہیں۔

دوڑ دھوپ کرنے کے لئے کوٹھی کا بڑا سالان ۔ تین دن اسی طرح سے گذر گئے بیچ بیچ میں کوئی کوئی رسم ہوتی ۔ ڈھول کے ساتھ گیت، گیت کے ساتھ چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے ناچ ۔ ہم سب لوگوں کو خوب مزا آرہا تھا۔ پھر آخر بارات کا دن بھی آ گیا اور ہم سب اچھے اچھے کپڑے پہن کر تیار ہو گئے ۔ خاص طور پر ہم سب بہنیں تو غرارہ پہن کر اس کا پائچہ پکڑ کر چل رہے تھے جیسے ہم لوگ رانیاں ہیں ۔ بج سنور کر سب ایک دوسرے پر سبقت لے جارہی تھیں ۔

لڑکی والوں کے یہاں پہنچ کر اور اچھا لگا خوب خوب سجاوٹ اور بہترین انتظام دیکھ کر ہم لوگوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں ۔ شہنائی کی خوبصورت آواز اور اس پر طرح طرح کی آتش بازی رونق کچھ اور تھی ہم بچے تو خوب لطف اندوز ہور ہے تھے ۔ ایک صوفے سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے صوفے پر کودر ہے تھے ۔ پھر لوگوں کی ڈانٹ پڑتی تو تھوڑی دیر کے لئے شرارت کم ہو جاتی ورنہ پھر وہی حال ۔ لڑکے تو اور بھی کود رہے تھے ۔ کئی بار ہم لوگوں کے لئے بادام کا شربت اور پتے کی مٹھائی وغیرہ آئی ۔ خوبصورت ہار بھی ہم لوگوں کو پہنایا گیا۔ عقد کے بعد بھی خوبصورت طشتری میں ہم لوگوں کو مٹھائیاں ملیں ۔ قوالی ہو رہی تھی اور ہم لوگ بڑی شان وشوکت سے کھانے کے لئے بیٹھے ۔ کھانے کے اتنے قسم تھے کہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کھائیں اور کیا چھوڑیں ۔ میں بار بار یہ سوچ رہی تھی کہ پٹنہ میں اتنا اچھا انتظام اور کھانا کیوں نہیں ہوتا ہے ۔ کیا وہاں لوگوں کے پاس پیسہ نہیں ہیں ۔ اسی وقت سے مجھے پیسوں کی اہمیت کا پتہ لگ گیا تھا۔ پیسے رہیں تو انسان ہر خوشی حاصل کر سکتا ہے۔

اسی ہنگامے میں دو دون اور گذر گئے ۔ پھر لڑکے والوں کے یہاں چوتھی کا انتظام ہونے لگا تھا۔ یعنی ہم لوگوں کی طرف ۔ یہاں بھی خوب سجاوٹ ہورہی تھی ۔ دونوں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی پوری کوشش کر رہے تھے ۔ یہاں بھی

سجاوٹ اور کھانے پینے کی تیاریوں میں کوئی کمی نہیں تھی۔

ایک پیاری سی بجی سجائی دُلہن تو ہم لوگوں کے ساتھ آ گئی تھی ہم سب نئی دُلہن کو گھیر کر بیٹھے رہتے تھے۔ چوتھی کے دن تو دُلہن کو اور بھی سجایا گیا۔ رشتہ داروں اور دوستوں کے آنے کا سلسلہ بھی صبح سے ہی شروع ہو گیا۔ شام ہوتے ہی اور بھی بھیڑ بڑھ گئی اور دُلہن کے مائکے والے بھی کافی سامان لے کر آ گئے۔ جہیز کا بھی کافی سامان آیا۔ پارٹی خوب زبردست رہی۔ ہم سب بچوں کو تو خوب مزا آیا۔ ہم لوگوں کو دونوں طرف سے خوبصورت اور قیمتی جوڑے ملے۔ اسی ہنگامے میں کئی دن گذر گئے۔

پٹنہ سے آنے والی بواؤں میں ہم لوگوں کے ساتھ ایک شبراتن بوا بھی آئی تھیں اور ان کے ساتھ ان کا تیرہ چودہ سال کا بیٹا شمسو بھی تھا۔ شمسو نے کلکتہ میں اپنے کچھ دوست بھی بنا لئے تھے اور وہ روزانہ ہگلی ندی میں نہانے اور تیراکی سیکھنے کو جانے لگا تھا۔ منع کرنے کے باوجود بھی وہ نہیں مانا۔ ہم لوگوں کے ماموں جان نے ہم سب بچوں اور شمسو کو بھی کلکتہ کی خوب خوب سیر کرائی۔

ہم لوگوں کے پٹنہ واپس آنے کے لئے صرف چند دن رہ گئے تھے کہ کچھ لڑکے جو شمسو کے دوست بن گئے تھے۔ آ کر منحوس خبر سنایا کہ شمسو ہگلی ندی میں ڈوب گیا اور کچھ پتہ نہیں چل رہا ہے۔ اتنی خوشی منانے کے بعد اس خبر نے ہم سب کو بہت افسردہ کر دیا۔ شبراتن بوا تو روتی چلاتی ہگلی ندی کی طرف بھاگیں اور پھر گھر کے کئی مرد نوکر وغیرہ بھی وہاں پہنچ گئے۔ ہزار کوشش کے بعد بھی شمسو کو نکالا نہیں جا سکا۔ ہم سب بھائی بہنیں شمسو کے لئے رو رہے تھے بڑے بزرگ بھی بے چین تھے لیکن شبراتن بوا کا تو عجیب حال تھا۔ بھوکی پیاسی وہ کئی دنوں تک ہگلی ندی کے کنارے بیٹھی رہیں۔ جیسے ندی کے ہر قطرے سے سوال کر رہی ہیں میرے بچے کو تو نے کیوں نگل لیا۔ میرے شمسو کو مگرمچھ نے نگل گیا۔ کیا میرے بچے کو مچھلیوں نے کھا لیا۔ زندہ یا مردہ میرے بچے کو میرے حوالے کر دو' انہیں سب جملوں کو وہ بار بار دہراتیں جاتی تھیں۔

ہم لوگ تو چند دنوں کے بعد پٹنہ لوٹ آئے مگر شبراتن بوا کسی طرح آنے کو تیار نہ ہوئیں۔ وہ روزانہ ہگلی ندی کے پاس جا کر بیٹھتی تھی۔ ایک ماہ کے بعد نا امید ہو کر پٹنہ آ گئیں اور روزانہ کی زندگی شروع ہوگئی مگر شبراتن ہر روز بیٹے کو یاد کر کے رونے لگتیں تھیں۔

کئی سال گذر گئے۔ ایک دن لوگوں نے ہنگامہ کیا کہ شمسو آ گیا۔ بھکشو سادھو کے ساتھ۔ بارہ سال گذر گئے ہم سب لوگ بڑے ہو گئے تھے اور باہر نکلنا بند ہو گیا تھا۔ جھانک کر دیکھا واقعی شمسو جوگیا لباس پہن کر گلے میں رود، اس کی مالا گلے میں ایک جھولا لٹکا ہوا سر پر جوگیا پگڑی۔ ہاتھ میں کامنڈل جیسے خبر ملی شبراتن بوا اس کے پاس چلی گئیں اور مستقل اس کے پاس بیٹھی رہیں اور باتیں کرتی رہیں اور سمجھاتی رہیں۔ شمسو کے ساتھ آئے ہوئے سادھوں نے بتایا کہ شمسو بہتے بہتے ان کی کٹیا کے پاس آ گیا تھا ہم لوگوں نے اسے مردہ حالت میں نکالا اور جڑی بوٹی کے ذریعہ اسے بچایا ہے۔ پھر ہم لوگوں نے اسے زندہ کرنے کے بعد اسے بھکشو بنانے کی قسم کھلائی اور بارہ سالوں تک تپسیا کرنے کے بعد یہ بھکشو بن گیا ہے اور اب اسے اپنی ماں کے انچل کا ایک ٹکرا لینا ہے جسے جلا کر اشلوک پڑھے جائینگے اور پھر شمسو پورا بھکشو بن جائے گا۔ اس لئے اسے انچل کا ایک ٹکرہ دیدیں ہم لوگ چلے جائینگے۔ سب لوگوں نے مل کر شمسو کو اور اس کے ساتھیوں کو ہزار سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ کسی طرح تیار نہ تھا۔ تین دن بھوکے پیاسے یہ سارے سادھو سڑک پر ہنگامہ کرتے رہے۔ شبراتن بوا نے بیٹے سے جھولا اک تارہ لے لیا لیکن وہ رکنے کو تیار نہ تھا۔ بھوکے پیاسے سڑک پر بیٹھے یہ سادھو نے ایک تماشہ کر دیا تھا۔ یہ سادھو کبھی بنگلا اور کبھی ملی جلی اردو بول رہے تھے اور خوب چلا رہے تھے۔

ان سادھوؤں کے رونے دھوے اور ہنگامے سے محلے والے بھی پریشان تھے۔ نہ شمسو رکنے کو تیار تھا اور نہ شبراتن بوا آنچل دینے کو اور اسی طرح پانچ دن گذر گئے بھوکے سادھو کی حالت غیر ہوگئی۔ اپنے سے یہ سادھو سڑک کے نل سے پانی پی

لیتے مگر ایک دانہ منہ میں نہیں گیا۔ سب لوگوں نے شبراتن بوا کو سمجھایا کہ اس طرح سے تو شمسو مر جائے گا۔ اس سے بہتر ہے کہ آنچل کا ٹکڑا دے دو وہ کسی قیمت پر رکنے کو تیار نہیں ہے تو کیا کیا جائے۔ روتے روتے شبراتن بوا نے اپنا آنچل پھاڑ کر اسے دیدیا۔ شبراتن بوا کی طبیعت بگڑ گئی۔ ہم سب لوگ بھی رونے لگے۔ شمسو ان بھکشوؤں کے ساتھ چلا گیا۔ دور تک ہم لوگ اسے جاتے دیکھتے رہے۔

کلکتہ کی شادی کی یادیں جتنی خوبصورت ہیں اسی طرح شمسو کا اس طرح جانا تکلیف دہ لگتا ہے۔ ذہن میں دونوں باتیں آتی ہیں۔ ایک دل کو خوش کرنے والی اور دوسری تکلیف دینے والی۔

میّا

میاں میاّ ہر طرف میاّ میاّ کی پکار۔ میاّ کا اصل نام کیا تھا یہ تو کسی کو نہیں معلوم لیکن گھر کے بزرگ بلاقن کی ماں کہتے لیکن ہم سب بچے میاّ میاّ کہہ کر بلاتے۔ یوں تو گھر میں کئی نوکرانیاں تھیں لیکن میاّ کی اہمیت کچھ زیادہ تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میاّ نے ہمارے چھوٹے چچا جان کو دودھ پلایا تھا۔ پہلے یہ طریقہ پتہ نہیں کیوں تھا کہ ہر بچے پر ایک کھلائی اور ایک دودھ پلائی رکھی جاتی تھیں۔ میاّ کی بیٹی بلاقن کی اہمیت بھی گھر میں بہت تھی کیونکہ وہ چھوٹے چچا کی دو بہنیں تھی۔ بلاقن ماں کو میاّ کہتی تھی اس لئے ہم لوگ بھی میاّ کہنے لگے۔

میاّ کے ذمہ گھر کی بہت ساری ذمہ داریاں تھیں جیسے گھر کی عورتوں کو کہیں جانا ہو تو میاّ بگھی والے کو بلاتی ساتھ ساتھ جاتی اور ساتھ لے کر آتی۔ بازار سے سودے لاتی۔ رنگریز کے یہاں ساریاں رنگنے کو دینا۔ دھوبی کے یہاں کا کام اس کے علاوہ چھوٹے بڑے کتنے کام جو میاّ آسانی سے پورا کر دیتی تھی۔

ہم سب بچے میاّ سے اس قدر ڈرتے تھے کہ کب میاّ ہمارے بزرگوں سے

شکایت کر کے ہم لوگوں کو ڈانٹ کھلوا دے۔ میاؔ کی اہمیت گھر میں اس قدر تھی کہ اکثر گھر کے معاملوں میں اس کی رائے بھی اہمیت رکھتی تھی اور میاؔ کی باتوں کو ٹالا بھی تو نہیں جاتا۔ میاؔ نکتہ چینی کرنے میں بھی بہت تیز تھی۔ ہر کام کو بہت سوچ سمجھ کر کرتی۔ یہاں تک کہ سونے چاندی کے زیور تک بنوانے کا ذمہ بھی اسی کا رہتا تھا۔ اسی عورت پر سب کا بھروسہ تھا۔

میاؔ دیکھنے میں اس قدر خطرناک تھی کہ رات کے اندھیرے میں اگر کوئی نیا شخص دیکھ لے تو ڈر جائے۔ رنگ گہرا کالا۔ ناک چپٹی۔ کالے رنگ پر سفید بڑے بڑے دانت جو باہر کی طرف نکلے ہوئے تھے۔ سفید چمکتی ہوئی آنکھیں۔ قد اس قدر چھوٹا کہ دور سے نظر نہ آئے۔ جسم میں پھرتی اس قدر زیادہ کہ گھنٹوں کا کام منٹوں میں کر لے۔ اندر سے باہر تک کا کام میاؔ کو چھوڑ کر کوئی نہیں کر سکتا۔

جھوٹ اور شکوہ شکایت سے میاؔ ہمیشہ دور رہی۔ روزے نماز کی سخت پابند۔ ہم بچے اکثر میاؔ کے ساتھ نماز پڑھا کرتے بلکہ اس کے لئے ہم بچوں کے بیچ دھکہ مشتی بھی ہو جاتی۔

شادی بیاہ کے موقع پر میاؔ زوردار آواز سے گیت گاتی اور گھر کو گلزار کر دیتی اور اپنی بھرپور خوشی کا اظہار کرتی۔

میاؔ ہم سب بچوں کو لے کر دیوالی، دسہرہ، اور محرم دیکھانے لے جاتی۔ بچے آپس میں ڈوڑ لگاتے۔ جھگڑے کرتے اور میاؔ کی جھڑکیاں سن کر بھی ہم لوگوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور ہم لوگ خوب لطف اندوز ہوتے اور کھلونے وغیرہ خرید کر گھر لوٹتے۔

عید بقرعید کی تیہواروں میں ہم سب بچے میاؔ کے پاندان کے ڈبوں میں رکھتے وہ آسانی سے ہم سب بچوں کے پیسوں کا حساب رکھتی اور ہم سب بچوں کو بڑا اطمینان رہتا کہ ہم لوگوں کے پیسے حفاظت سے ہیں۔ کبھی کبھی تو میاؔ ہم لوگوں کے

پیسوں کا حساب کرتے کرتے ناراض ہو جاتی اور ہم لوگوں کو پیار بھری جھڑکی پڑتی لیکن سب لوگوں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا کیونکہ ہم لوگ اس کے عادی بن چکے تھے۔

اگر محلے کے بچوں سے ہم لوگوں کا جھگڑا ہو جاتا تو میاّ مخالف پارٹی کو سمجھا بجھا کر معاملہ صاف کرا دیتی اور جھگڑا ختم ہو جاتا اور ہم لوگ پھر خوشی خوشی کھیل کود میں مصروف ہو جاتے۔

میاّ کو چھوٹے بچوں سے اس قدر دلچسپی تھی کہ کسی بچے نے رونی شکل بنائی لیکن میاّ کی گود میں جاتے ہی وہ خوش ہو جاتا۔ میاّ اپنے موٹے اور کالے ہونٹ بچکا کر ایسی شکل اتارتی کہ بچہ ہنسنے لگتا۔

شکل صورت ایسی رہنے کے باوجود بھی میاّ ہر دل عزیز تھی۔ جن جن لڑکیوں کی شادی میں میاّ ساتھ گئی سب کے سسرال سے کپڑے روپے کے ساتھ بہت ساری تعریف بھی بٹور لائی اور برسوں تعریف ہوتی رہی۔

میاّ نے زندگی میں ایک غلطی ضرور کی تھی جس کا ذکر وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر کرتی تھی۔ اس نے اپنی اکلوتی بیٹی بلاقن کی شادی سب کے منع کرنے کے باوجود ایک چار بچوں کے باپ سے اس لئے کر دی کہ اس کے پاس بڑا سا مکان کھیت اور پیسے تھے۔ بلاقن ہمیشہ اس کا طعنہ اپنی ماں کو دیتی رہتی تھی پر میاّ خاموشی سے سب برداشت کر لیتی چونکہ خود اس نے غلطی کی تھی ہمیشہ پچھتاتی رہتی تھی۔ بلاقن کے اپنے کوئی بچے بھی نہیں ہوئے۔

اگر میاّ کبھی بیمار پڑ جاتی تو گھر میں افراتفری مچ جاتی۔ بچے بے چین پریشان اور بڑے بھی اس کی کمی کو شدّت سے محسوس کرتے حالانکہ میاّ مدد کرنے کو اٹھ بھی جاتی تھی۔

دھیرے دھیرے میاّ کمزور ہوتی چلی گئی اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ

اٹھنے بیٹھنے کے لائق نہیں رہی اور پھر وہ بالکل بستر پر آ گئی اسے اپنے کام کے لئے دوسروں کی مدد کی ضرورت ہونے لگی۔ گھر کا ہر فرد اس کی دیکھ بھال کر رہا تھا دوسری بوا بھی اس کی خدمت کرتی رہتی تھی لیکن میاؔ کی حالت روز بروز بگڑتی چلی گئی۔ سب لوگ میاؔ کی حالت دیکھ کر افسردہ ہو جاتے۔ میاؔ کی کمزوری اور حالت کو دیکھ کر ہم سب بچے بھی حیران تھے اور پھر ایک دن میاؔ ہم سب لوگوں کو چھوڑ کر چلی گئی۔ بڑوں کے ساتھ ہم سب بچے بھی خوب خوب روتے۔ جب میاؔ کو آخری منزل کے لئے تیار کیا گیا تو اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ وہ بہت پر کشش لگ رہی تھی مجھے آج بھی یاد ہے سفید لباس جو اس کے آخری لباس (کفن) تھا پر اس میں بھی وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ جب میاؔ کو لوگ لے جانے کو آئے تو ہم سب لوگ خاص طور پر بچے چلاّ چلاّ کر رو پڑے۔ کیا میاؔ ہم لوگوں سے ناراض ہو کر چلی گئی کیا وہ پھر واپس نہیں آئیگی یہ سب سوال ہم سب بچوں کے دماغ میں بار بار آ رہے تھے اور جواب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ کون سا ملک ہے جہاں جا کر لوگ لوٹ کر نہیں آتے اور وہاں جانے کیلئے بھی خاص طور کی سواری ڈولی آتی ہے۔ ہم سب بچے آپس میں ایک دوسرے سے سوال جواب کرتے جو ہم لوگوں کے دماغ سے بہت بالاتر تھا۔ بڑے بچوں کو تو موت کا مطلب سمجھ میں آ گیا تھا پر ہم سب کو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ میاؔ کی موت کے بعد گھر میں اس قدر سناٹا چھائی جیسے قبرستان میں یاد کرنے کے لئے بہت سی باتیں چھوڑ گئی جسے ہم لوگ ابھی تک یاد کرتے رہتے ہیں۔ چھوٹے بچے تو میاؔ کو یاد کر کے نیند میں چلانے لگتے تھے۔ کبھی کبھی تو بچے دروازے تک جا کر میاؔ کو پکار آتے اور پھر ناامید ہو کر واپس آ جاتے۔

یہ کالی کلوٹی سی عورت نے جو چھاپ اور جو پیار ہم لوگوں کے بیچ چھوڑ گئی وہ زندگی بھر ہم لوگوں کو یاد رہے گا۔ گو بلا قن میاؔ کی خود کی بیٹی تھی پر جس طرح کا پیار اس نے ہم سب لوگوں کو بانٹا اس کا کچھ ہی حصہ وہ اپنی اولاد کو نہ دے پائی۔ میاؔ کی سنائی

ہوئی کہانیاں آج بھی مجھے یاد ہیں۔ شیر۔ بندر۔ بھالو۔ بھوت اور جن کی کہانیاں کچھ اس طرح سناتی جیسے ہم لوگوں کے سامنے سب کچھ ہے۔

آج جب میں خود زندگی کے آخری ڈھلان پر ہوں میاّ کو یاد کر کے رو دیتی ہوں ایسی شخصیت جس کے لئے غیر بھی برسوں آنسو بہائیں۔ کیا جنت الفردوس میں اس کو جگہ نہیں ملے گی۔ اللہ اسے کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور جنت الفردوس میں جگہ دے (آمین)

ہرے ہرے نوٹ

دو سال قبل میں گھر سے نکل گئی۔ فضلو کے ساتھ۔ میں اپنے ماحول سے گھبرا گئی تھی۔ ایک کمرے کا یہ چھوٹا سا مکان جو ایک سکری اور گندی گلی میں تھا۔ زندگی کے اٹھارہ سال گذرا ر دیئے لیکن میری زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی سوائے اس کے کہ میں چھوٹے سے بڑی ہوگئی۔ مجھے کہیں جانے کی اجازت نہیں تھی اور نہ ہمارے گھر کوئی آنا جانا تھا سوائے فضلو کے جو عمر میں مجھ سے دس بارہ سال بڑا تھا۔ فضلو کے ماں باپ مر چکے تھے۔ بھائی بہنوں کو اس سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ سب بہت ہی غریب تھے اور کمانے کھانے میں مصروف رہتے تھے۔ جب میں بہت چھوٹی تھی۔ فضلو ہمارے گھر آتا تھا اور اپنے رشتہ داروں اور گھر والوں کے بارے میں باتیں کرتا تھا۔ جہاں تک میری یادداشت ساتھ دے رہی ہے۔ قریب پندرہ سالوں میں میں فضلو کو اپنے گھر آتے جاتے دیکھ رہی ہوں۔ گھر کا سامان وہ بازار سے لا دیتا اور کبھی کبھی ہمارے لئے ٹافی بھی۔ ہماری امی اس کو پیسے دیدیتی اور وہ بازار سے سب چیزیں لا کر امی کے حوالے کر دیتا تھا۔ فضلو کے علاوہ ہمارے اس چھوٹے سے مکان میں کسی کا آنا جانا تو تھا نہیں۔

جب میں اسکول جانے کے لائق ہوئی تو ہم نے امی سے اسکول جانے کی خواہش ظاہر کی پر امی نے صاف صاف کہ دیا کہ ہمارے لئے اسکول جانا ممکن نہیں ۔کیونکہ ہمارے باپ نے ہمارا داخلہ کرانے کیلئے صاف منع کر دیا۔ میں کھڑکی سے لڑکیوں کو اسکول جاتے دیکھتی تو بڑی خواہش ہوتی۔ اسکول جانے کی خواہش کو دل میں دبا کر خاموش رہی۔

میں بچپن سے دیکھ رہی ہوں کہ ایک شخص ہماری امی کے پاس ہرے ہرے نوٹوں کی ایک بنڈل لے کر آتا ہے اور ہماری امی کے ہاتھوں میں دے دیتا ہے۔ وہ شخص ہمیشہ شام ہونے پر آتا اور رات ہوتے ہی گھر سے نکل جاتا۔ امی ان ہرے ہرے نوٹوں کو لے کر بہت خوش ہوتیں اور دھیرے دھیرے میں بھی ان نوٹوں کو دیکھ کر خوش ہونے لگی کیونکہ نوٹوں کے ذریعہ ہماری ضرورت پوری ہوتی۔ ہمارے کھلونے اور فراک آتے تھے۔ نوٹوں کے ہاتھ میں آتے ہی امی کے چہرے پر رونق آجاتی اور میں بھی ان نوٹوں کو دیکھ کر خوش ہونے کی عادی ہوگئی۔

فضلو مزدوری کر کے زندگی گذارتا تھا اس کا کوئی مستقل گھر بھی نہیں تھا۔ کبھی مندر، مسجد کے اوٹے پر اور کبھی کسی کی دوکان میں رات گذارتا مگر فضلو نماز ضرور پڑھتا تھا۔ اللہ کا ذکر مجھ سے اکثر کرتا تھا۔ جب ہماری عمر تیرہ چودہ سال کی ہوگئی تو ہم نے اس شخص کے بارے میں جاننا چاہا۔ وہ کیوں ہماری ماں کے پاس اکثر آتا ہے اور خاموشی سے چلا جاتا ہے۔ میری ماں نے بتایا یہ شخص تمہارا باپ ہے یوں تو وہ اعلیٰ خاندان اور پیسے والوں کے خاندان کا ہے لیکن وہ اچھا انسان نہیں ہے۔ یہ شخص ہمارے بھائیوں کے پاس آتا تھا اور پھر اس نے مجھ سے دوستی بڑھائی ۔ میں بھی اس کے نزدیک آگئی اور یہ سلسلہ اس طرح چلا کہ اکثر ہم لوگ ساتھ رہتے اور کبھی کبھی تو وہ رات بھی ہمارے گھر میں گذارتا۔ میں یہ سوچ رہی تھی کہ ایک اچھے خاندان کا انسان

ہے۔ مجھ سے شادی کرے گا اور ایک اچھی اور شریفانہ زندگی بھی دیگا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ تمہاری پیدائش کے دو چار ماہ پہلے میرے بھائیوں نے میرا نکاح اس شخص سے کرا دیا اور پھر اس شخص نے مجھے ایک چھوٹے سے گھر میں رکھ دیا اور پچھلے کئی سالوں سے میں اس گھر میں خاموشی کی زندگی گذار رہی ہوں۔

میری ماں نے بتایا ''تمہارے باپ کا خاندان بہت اعلیٰ اور خوبصورت ہے۔ تمہارا رنگ اور نقشہ انہیں لوگوں کی طرح خوبصورت ہے۔ میں آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے کو بار بار نہارتی واقعی میں مجھے خود اپنی شکل بہت پیاری لگنے لگی تھی۔ میری خواہش ہوتی میں کھلے آسمان کے نیچے کھلی ہوا میں دوڑ لگا دوں لیکن میری ماں کے مطابق میرے ہرے ہرے نوٹوں والے باپ کو یہ سب پسند نہ تھا۔

میری ماں نے بتایا کہ تمہارے باپ کو ایک عدد بیوی اور ہے اور بچے بھی لیکن اسے پہلی بیوی پسند نہیں۔ میں نے امی سے پوچھا پھر ہمارے پاپا ہم لوگوں کے ساتھ کیوں نہیں رہتے۔ ہماری ماں نے جواب دیا۔ سوسائٹی کے ڈر سے۔ میں نے پوچھا پہلی بیوی کے ساتھ کیوں رہتا ہے۔ اس نے کہا سوسائٹی کے ڈر سے دو عورتوں کو دھوکا دے رکھا ہے کس قدر کمینہ انسان ہے یہ مجھے اس شخص پر بہت غصہ آتا۔

میری ماں نے بتا دیا کہ تم اپنے باپ کی ناجائز اولاد ہو۔ اس لئے میں تم کو کسی سے ملا نہیں سکتی۔ وہ شخص جو تمہارا باپ ہے۔ اس کا حکم ہے جسے ماننا ضروری ہے کیونکہ وہ ہمارا خرچ پورا کرتا ہے۔ میری امی نے مجھے بتایا کہ ہمارے ماموں یعنی میری ماں کے بھائیوں نے دلال کا کام کیا۔ ماں باپ ہمارے تھے نہیں۔ بھائیوں نے میرا نکاح کسی طرح اس شخص سے کرا کر ایک موٹی رقم وصول کر کے اس گناہ پر پردہ ڈالنے کی قسم کھالیا۔ تب سے اب تک یہ شخص مجھے خرچ دے رہا ہے۔

سب باتیں سن سن کر مجھے اپنے باپ سے نفرت بڑھتی گئی۔ چودہ پندرہ سال کی میری عمر ہو گئی۔ میں بہت کچھ سمجھنے کے لائق ہو گئی تھی۔ اپنے ناجائز باپ کو دیکھ کر

اس قدر نفرت ہوگئی کہ دیکھتے ہی مجھے ایسا لگتا کہ میں اس کے بال نوچ لوں اور منہ پر تھوک دوں اور پھر دھکے مار کر اسے گھر سے باہر کر دوں۔ میرا باپ ایک گرا ہوا انسان ہے۔ یہ سن کر تو میں اس شخص کے آتے ہی کمرے میں بند ہو جاتی۔ نیلے نیلے نوٹوں والے ناجائز باپ کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی۔ میں اس کمرے اور اس ماحول سے اس قدر گھبرا گئی تھی اور اس قدر پریشان ہو چکی تھی۔ میں نے امی سے کہہ دیا کہ میں اٹھارہ سال کی ہو گئی ہوں میں نے فضلو سے نکاح کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میری امی بھی شاید یہی چاہتی تھی اور محلے کے مسجد کے قاری صاحب نے میرا نکاح فضلو کے ساتھ پڑھا دیا۔ میری ماں نے میرے باپ سے اپنے حق کے چار لاکھ روپئے وصول کرتے تھے۔ اس نے میرے حق یا حصے کے دو لاکھ مجھے دے جسے لے کر میں فضلو کے ساتھ پونا آ گئی۔ پونا میں فضلو کے ایک رشتہ دار تھے۔ فضلو نے یہاں ایک چھوٹی سی دکان کھول لیا اور ایک چھوٹا سا گھر بھی کرائے پر لے لیا اور ہم لوگ خوشی خوشی رہنے لگے۔ میں اُس کوٹھری سے نکل کر بہت خوش تھی۔ فضلو جو کماتا ہمارے ہاتھ میں لا کر دیتا۔ دو سال میں میں ایک بچے کی ماں بھی بن گئی۔ فضلو ایک نیچے خاندان کا ہونے کے باوجود ایک اچھے شوہر ایک اچھے باپ کا فرض ادا کرتا تھا۔ ایک جاہل اور غریب خاندان کا ہونے کے باوجود بھی ایک شریف انسان تھا۔ جو اکتالیس سالوں تک کنوارا رہنے کے باوجود بھی اس نے کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا اور ایک ہمارا باپ کا اونچے خاندان کا ہو کر بھی ایسا ذلیل اور گرا ہوا انسان تھا جس نے مجھے اور ہماری ماں کو گمنامی کی زندگی دی۔

یہاں آ کر میں نے اپنی ماں سے کوئی واسطہ نہیں رکھا۔ وہ اپنے ہرے ہرے نوٹوں کے ساتھ خوش ہو گئی۔ ان ہرے ہرے نوٹوں میں کتنی طاقت ہے جو کسی کے گناہ پر پردہ ڈال دیتا ہے اور کسی کو عزت بخش دیتا ہے۔ مجھے اپنی ماں سے ہمدردی تو ضرور تھی پر نفرت بھی۔ جس کی ایک بھول نے مجھے کس قدر تکلیف دی اور ہماری زندگی عمر بھر باپ کے پیار کے لئے ترستی رہی۔ اس عورت کی وجہ کر میں گھٹ گھٹ کر جیتی

رہی۔ کبھی آواز بھی اٹھائی تو ہرے ہرے نوٹوں کے لئے وہ ہمیشہ خاموش رہی۔

پونا میں فضلو نے میرے لئے ایک مولوی بھی پڑھانے کے لئے رکھ دیا اور میں بچپن کی اس خواہش کو بھی پوری کر رہی ہوں۔ مجھے فضلو جیسا شوہر ملا ہے۔ اپنے آپ کو ایک خوش نصیب عورت سمجھتی ہوں۔

آج بھی جب مجھے اپنے باپ کی شکل یاد آتی ہے تو گھن آنے لگتی ہے۔ جس شخص نے میری ماں کی آواز اور ہماری سسکیوں کو ہرے ہرے نوٹوں کے نیچے ہمیشہ کے لئے دبا دیا اور خود عزت کی زندگی گذار رہا ہے۔ سوسائٹی میں ایک اچھا مقام بنا کر رکھا ہے۔

آج بھی جب فضلو مجھے ہرے ہرے چند نوٹ لا کر دیتا ہے تو میرے چہرے پر رونق آجاتی ہے۔

نزدیک کا رشتہ

ہمارے محلے میں ایک چچا جان ہیں جن کو بڑے لوگوں سے رشتہ جتاتے اور فائدہ اُٹھانے کا بڑا شوق ہے۔ بڑے بڑے لوگوں سے وہ نزدیک کا رشتہ بتا کر دوسروں کا کام کرانے کی پوری پوری کوشش کرتے ہیں کہاں تک ان کو اس کام میں کامیابی ہوتی ہے۔ ویسے وہ کوشش تو پوری پوری کرتے ہیں۔ بڑوں سے رشتہ جوڑ کر وہ اپنے کو بڑا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک دن آکر کہنے لگے ''ابھی جو ہمارے شہر میں کلکٹر آیا ہے وہ ہمارا نزدیکی ہے۔ سوچو رشتہ دار جیسا ہے''۔ تم نے کہا یہ کیسے ممکن ہے وہ کائستھ ہے اور لچھمی پرشاد ورما ہے۔''

چچا جان نے فوراً جواب دیا'' رشتہ کیا صرف خون کا ہی ہوتا ہے۔ لچھمی بابو

ہمارے بھیا کے سالے کے سالے کے ساتھ پڑھتے تھے۔ دوستی اس حد تک تھی کہ ہر دسہرہ میں بھیا کے سالے کے سالے کے یہاں لکھمی بابو کے گھر سے تحفے اور کپڑے تک آتے تھے اور عید میں بقرعید میں بھیا کے سالے کے سالے کے یہاں سے ان لوگوں کے کپڑے اور مٹھائیاں سویاں جاتی تھیں۔ اس سے بڑھ کر رشتہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ میں نے ہاں میں ہاں ملا کر کہا۔ ہاں چچا جان رشتہ واقعی میں بہت نزدیک کا ہے۔

ایک دن ایک صاحب ہمارے یہاں آئے اور کہنے لگے ''ہمارے بیٹے کی شادی شہر کے مشہور وکیل شاکر صاحب کے یہاں طے ہو رہی ہے کیسا رہے گا چچا نے کہا، بہت ہی نزدیک کا ہے۔ ہمارے چچی کا بڑا بیٹا دلی میں ہے اس کا پھپھیرا سالہ وکیل صاحب کے بیٹے کا سالہ ہے۔ میں نے جواب دیا ہاں چچا جان بہت نزدیک کا رشتہ ہے آپ کے مطابق۔

چچا جان بہت ناراض ہو گئے کہا ''ایک ماں کے پیٹ سے پیدا بچے کیا رشتہ دار ہوتے ہیں۔ رشتے تو بہت طرح کے ہوتے ہیں۔ مسلمان کا رشتہ تو کہیں نہ کہیں سے لگ جاتا ہے۔

ایک بار تو چچا جان نے کمال کر دیا۔ شہر میں ایک صاحب بڑے پوسٹ پر آئے اور چچا جان نے ان سے رشتہ بتایا اور ملنے چلے گئے لیکن دربان نے گیٹ پر ہی روک لیا۔ چچا جان نے اپنے رشتے کا واسطہ دیا پھر بھی صاحب نے ان کو اندر نہیں بلایا جس پر چچا جان سخت ناراض ہوئے اور کہنے لگے کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ بد دماغ افسر کے یہاں جاؤ گے تو کتا دامن پکڑ لیگا اور محافظ کولر۔ کیا زمانہ آگیا ہے بدتمیزوں کا راج ہے۔ چپراسی نے کہا ''رجسٹر پر اپنا نام پتہ لکھا دیں تب صاحب ملنے کا وقت دینگے۔ یہ سن کر چچا جان اس قدر ناراض ہوئے کہ بغیر ملے ہی غصے میں پیر پٹکتے لوٹ

کر گھر آ گئے۔ افسر کو خوب خوب بد دعائیں اور چپراسی کو گالیاں سناتے رہے گھر بیٹھ کر۔

ایک بار چچا جان دلّی گئے اور وہاں بھی ایک صاحب سے ملنے گئے اور کہلوا دیا کہ صاحب سے جا کر بولو کہ آپ کے ابا کے رشتے دار آئے ہیں۔ پٹنہ سے اور ملنا چاہتے ہیں۔ چپراسی نے آ کر کہا کون ہیں اور کیا رشتہ ہے۔ چچا جان ناراض ہوتے ہوئے بولے کہہ دو آپ کے پھوپھا کے چچا کے سالے آئے ہیں۔ انہوں نے حد کر دی ایک طشتری میں چند بسکٹ اور ایک پیالی چائے بھجوا دیا اور سو روپیہ کا نوٹ چپراسی کو پکڑا دیا کہ اگر وہ ضرورت مند ہونگے اور مدد کے غرض سے آئے ہونگے تو یہ سو روپیہ دے دینا مگر چچا جان تو سخت ناراض تھے وہاں رُکے نہیں اور گالیاں دیتے ہوئے واپس آ گئے۔ پٹنہ آ کر ان صاحب کی خوب خوب دھجیاں اُڑائیں۔ چچا جان زمانے کی شکایت کرتے آج محبت ختم ہو گئی۔ ایک زمانہ تھا جب ہمارے نانا، دادا روپیوں کی گدی پر سوتے تھے۔

ہم نے چچا جان سے پوچھا آخر وہ گدیاں کہاں گئیں۔

چچا نے جواب دیا۔ دھیرے دھیرے نوکر دائیوں نے سب کو اڑا لیا۔"

"چا جان کے یہاں کوئی نیا آدمی آتا تو وہ سارے نوکروں کو پکارتے جو کبھی ان کے یہاں کام کر چکے تھے" ہم لوگوں کے اس سوال پر کہ نوکر تو صرف ایک ہی آیا۔ آپ نے اتنوں کو پکارا تھا۔ چچا جان جواب دیتے سب چھٹی پر چلے گئے ہیں۔ دھیرے دھیرے آئینگے عادت جو پڑ گئی ہے سب کو پکارنے کی۔"

چچا جان کے یہاں صرف ایک باورچن تھی جو سب کام کرتی تھی۔ جھاڑو پوچھا سے لے کر کھانا بنانے سے لے کر بازار سے سودہ تک لانے کا کام۔

جب چچا جان کے پاس کوئی بیٹھا رہتا۔ چچا جان اپنی اہلیہ کو پکار کر کہا کہ بیگم

دیکھو۔ بچوں کو مچھلی کا قورمہ اور چکن بریانی دلوا دو باورچن کو کہہ کر'' لیکن اُن کی بیگم نے باورچن کو جا کر کہا بچوں کو بھنجیا روٹی دیدو گی۔

ایک بار کی بات ہے ہمارے محلے کے ایک صاحب محمود صاحب ہمارے یہاں اپنے بچوں کے داخلے کے سلسلے میں بات کرنے آئے۔ چچا جان موجود تھے۔ فوراً بول اُٹھے کوئی بات نہیں ہے میں آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔ انشاء اللہ فوراً داخلہ ہو جائے گا۔ محمود صاحب کو چچا جان کا تجربہ تو تھا نہیں چچا جان کے ساتھ اسکول پہنچ گئے۔ جب محمود صاحب بچوں کے داخلے کے بارے میں باتیں کرنے لگے تو چچا جان ان کی سفارش میں بولنے لگے جس پر پرنسپل اس قدر ناراض ہو گیا اور محمود صاحب سے کہا کہ ان صاحب کو میرے آفس سے جانے کے لئے کہیں ورنہ داخلہ نہیں ہو سکے گا۔ چچا جان وہاں سے چلے تو ضرور آئے لیکن محمود صاحب کو بار بار کہتے رہے۔ اس اسکول میں بچوں کو داخلہ کسی قیمت نہیں نہ کرائیں جہاں کا پرنسپل اس قدر بدتمیز ہو۔ بچے ایسے اسکول میں کیا سکھ سکتے ہیں لیکن محمود صاحب نے بچوں کا داخلہ کرا دیا۔ چچا جان بہت دنوں تک محمود صاحب سے بھی ناراض رہے۔

شہر میں چچا سفارشتی کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ ہم نے اور خود ان کی بیوی بچوں نے بھی ان کو اس کام سے الگ رہنے کو کہا لیکن چچا جان کہاں سننے والے تھے۔ ہمارے محلے کے ایک صاحب جو کلکتہ سے تبادلہ کرا کر آئے تھے راشن کارڈ بنوانا تھا۔ چچا جان نے اس میں بھی اپنا ہاتھ لگا دیا کہنے لگے۔ یہ صاحب شہاب صاحب راشننگ افسر میرے ممیرے بھائی کے دوست کے سمدھی ہیں۔ میں ذریعہ لگا لونگا اور کام انشا اللہ ضرور ہو جائے گا اور اسی طرح وہ ضرورت مند صاحب کو لے کر راشننگ افسر کے گھر پر ملنے گئے اور اپنے رشتے کا ذریعہ لگایا لیکن راشننگ افسر نے ان کو آفس میں ملنے کے لئے کہا۔ چچا جان کا غصہ ایک سو چار ڈگری ہو گیا اور چلانے لگے ''میری

رشتہ داری والے جھٹکے کو ہمارے سامنے ہی پھاڑ دیا۔ بڑا افسر کا باپ بنا ہے" گیٹ کے باہر سے ہی چلا کر چلے آئے۔

میں برسوں سے چچا جان کو جان رہی ہوں۔ شاید ان کی کوئی شفارش کامیاب ہوئی ہو لیکن چچا جان باز نہیں آتے اور دوسروں سے وعدے کر لیتے اور کوشش کرتے ذریعہ لگانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔

اکثر چچا کی جھڑپ بیوی سے ہو جاتی وہ ہمیشہ یہ کہتی تھیں کہ جو وقت آپ دوسروں کے کام میں لگاتے ہیں گھر میں لگائیں لیکن چچا کا گھر میں دل لگتا تھا نہیں، وہ بس باہر کے کام تلاش کرتے رہتے۔ زیادہ بولنے پر جواب دیتے خدا کے لئے سب کر رہا ہوں کبھی نہ کبھی تو خدا اس کا اجر دیگا انشاء اللہ۔ چچا جان کی بیگم صاحبہ سخت ناراض ہو جاتیں اور چلانے لگتیں۔ مرنے کے بعد اجر ملے گا ابھی تو سب کی زندگی کو برباد کر رہے ہو۔ سزا تو دنیا میں مل رہی ہے۔

چچا جان کی کئی دکانیں تھیں اور ایک گھر بھی تھا سب کا کرایہ آتا تھا اور نمک روٹی چل ہی جاتی تھی۔ چچا جان بے فکری کی زندگی گذارتے تھے اور سفارشی کا کام کرتے تھے۔

ایک صاحب نے چچا جان سے کہا کہ ایک میڈیکل سارٹیفکیٹ بنوانا ہے۔ مجھے لے کر ڈاکٹر صاحب کے پاس چلیں۔ چچا جان تو موقع کی تلاش میں رہتے تھے۔ جھٹ تیار ہو گئے اور لگے ڈاکٹر صاحب سے خوشامدانہ باتیں کرنے اور شفارش کرنے۔ ڈاکٹر کافی صاف گو تھا اس نے کہا اگر یہ صاحب سفارش کرینگے تو فیس دوگنی لگ جائے گی آخر میں بیوی بچے والا ہوں۔ گھوڑا گھاس سے دوستی کرے گا تو کیا بھوک مریگا۔ یہ سن کر چچا جان شرمندہ ہوئے۔ پھر بھی ناراض ہو گئے ڈاکٹر صاحب سے اور کہنے لگے۔

خون سفید ہو گیا ہے کمبختوں کا رشتہ کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے کافی نزدیک کا رشتہ ہے میرا۔ رشتے کی کوئی قدر نہیں ہے، چھوڑو لوگ پیسوں کے لالچی ہو گئے ہیں۔

ماں

مُسکان جب بہت چھوٹی تھی اسی وقت اس کی پھوپھی شوبھا اور پھوپھا جانکی بابو نے اُسے گود لے لیا تھا۔ جب سے مسکان نے ہوش سنبھالا پھوپھی اور پھوپھا کے پاس رہ رہی تھی۔ مسکان کو اس قدر پیار مل رہا تھا کہ کیا کہا جائے۔ ایک سے ایک کپڑے اور کھلونے اس کے لئے آتے تھے۔ شوبھا اور جانکی بابو اس بچی پر جان چھڑکتے تھے۔ صرف پندرہ دنوں کی تھی اس وقت شوبھا نے اسے گود لے لیا تھا۔ شوبھا کی شادی کو بیس سال ہو گئے تھے لیکن ان لوگوں کے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی اور شوبھا نے جانکی بابو کے مشورے کے ساتھ اپنے بھائی منوج اور بھابھی اوشا کی چند دنوں کی بچی کو گود لے لیا۔ کورٹ کچہری سے پورے طور پر ان لوگوں نے اوشا کی بیٹی کو گود لے لیا اور خوب زبردست تقریب بھی کی گئی۔ بیس سالوں تک شوبھا کو کوئی اولاد نہیں ہوئی تو شوبھا بہت سست رہنے لگی تھی۔ حالانکہ جانکی بابو نے علاج میں کوئی کمی نہیں رکھی۔ خود بھی شہر کے مشہور ڈاکٹر تھے اور زبردست پریکٹس تھی۔ پیسے کی کوئی کمی تھی نہیں اس لئے امریکہ اور انگلینڈ میں بھی علاج کرایا گیا لیکن سب بے سود رہا۔ ان لوگوں کے دل میں صاحب اولاد ہونے کی تمنا رہ گئی اب جب گھر میں مسکان کی کلکاری گونجتی تو دونوں میاں بیوی خوش ہو جاتے۔ مسکان کے کھلونے اور کپڑے اِدھر اُدھر رہتے تو جانکی بابو اور شوبھا خوش ہو جاتے اور مسکان کے ساتھ وقت گذار کر جانکی بابو کی تھکاوٹ دور ہو جاتی۔ گھر میں ایک بچے کے آ جانے سے شوبھا اپنی سب

تکلیفوں کو بھول گئی تھی۔ مسکان کی پرورش بڑی شان شوکت سے ہو رہی تھی۔ شوبھا خود سے مسکان کے لئے اچھے سے اچھے کپڑے خرید کر لاتی۔ جانکی بابو نے تو کھلونوں کا ڈھیر لگا دیا تھا۔ مسکان کی ہر فرمائش کو وہ لوگ پوری کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اوشا کے بچوں کو یہ سب کہاں حاصل۔ گو شوبھا اوشا کے دوسرے بچوں کے لئے بھی اکثر کھلونے اور کپڑے لاتی لیکن مسکان کے مقابلے کے نہیں۔ اوشا کے مسکان کو چھوڑ کر اور چار بچے تھے۔ دو بیٹا اور دو بیٹیاں بڑی آشا تھی۔ جس کی عمر مسکان کی پیدائش کے وقت آٹھ سال تھی اور اسے یہ اچھے سے معلوم تھا کہ مسکان اس کی پھوپھی کی نہیں بلکہ اس کی ماں کی اولاد ہے۔

مسکان کی اس قدر خاطر اور پیار دیکھ کر دوسرے بچوں میں جلن پیدا ہو رہی تھی۔ جب شوبھا آشا اور اس کے چھوٹے بھائی بہن کو کچھ لا کر دیتی تو اسے ایسا لگتا جیسے اس کے آنسو پوچھے جا رہے ہیں۔ اسے بھیک مل رہی ہے اور وہ ان چیزوں کو حقیر نظروں سے دیکھتی۔

وقت گذرتا گیا اور سب بچے بڑے ہوتے گئے اور وقت کے ساتھ سب بچوں میں مسکان کے لئے جلن کا مادہ بڑھتا گیا۔ اوشا اور شوبھا کے گھر بھی پاس پاس تھے۔ ہر وقت کا آنا جانا ہوتا رہتا تھا۔ شوبھا کی عالیشان کوٹھی تھی لیکن اوشا کا تین کمروں والا مکان تھا۔

مسکان چار سال کی ہوگئی اور اس کا داخلہ اسکول میں ہوگیا۔ بہترین اسکول کا خوبصورت یونیفارم چمکتا ہوا جوتا اور مسکان خوشی خوشی اپنی کار سے اسکول جاتی۔ خود شوبھا اسے پہنچانے اور لانے جاتی۔ کبھی ڈرائیور کے ساتھ اسے اکیلے نہیں جانے دیتی تھی۔ یہ سب دیکھ کر باقی بچوں میں احساس کمتری پیدا ہو رہی تھی۔ وہ اسکول بس سے جاتے جو کھچا کھچ بھری رہتی تھی۔ بچوں نے آ کر ماں سے کہا ہم لوگ بس سے جاتے

ہیں جو اس قدر بھری رہتی ہے۔ ہم لوگوں کو اکثر بیٹھنے کی جگہ بھی نہیں ملتی ہے اور مسکان اکیلے گاڑی سے جاتی ہے۔ ہر بچہ اوشا سے سوال کرتا۔ آخر ہم لوگوں کو پھوپھی کے پاس کیوں نہیں رکھا۔ ہم لوگوں کی بھی یہی شان ہوتی۔ اوشا ان لوگوں کے اس بے تکے سوال پر کچھ جواب نہیں دے پاتی۔ جب شوبھا مسکان کو لے کر اپنے بھائی کے گھر آتی تو سب بچے ادھر ادھر ہو جاتے۔ کوئی آکر پھوپھا پھوپھی اور مسکان سے ملنا نہیں چاہتا۔ وقت تیزی سے گذر رہا تھا۔ مسکان تیزی سے بڑی ہو رہی تھی اچھا کھانا اور اچھے رہن سہن کی وجہ کر وہ بڑی بھی لگنے لگی تھی اور خوبصورت بھی۔

وقت تیزی سے گذر رہا تھا اب مسکان آٹھ سال کی ہوگئی تھی۔ ایک دن آشا نے مسکان کو یہ بتا دیا کہ تم ہم لوگوں کی سگی بہن ہو تم اپنی ممی (شوبھا) پھوا کے پیٹ سے پیدا نہیں ہوئی ہو بلکہ ہماری ممی کی پیٹ سے۔ ہم سب لوگوں کی طرح سے پیدا ہوئی ہو۔ مسکان کو عجیب سا لگا اور اس نے جا کر شوبھا سے پوچھا۔ ''ممی کیا میں تمہارے پیٹ سے نہیں بلکہ آشا دیدی کی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئی ہوں''

شوبھا خاموش ہوگئی اور رو پڑی۔ شوبھا کو یہ پتہ لگ گیا کہ یہ بات آشا نے بتائی ہوگی۔ مسکان کی پیدائش کے وقت وہ آٹھ سال کی تھی اور سب کچھ جاننے سمجھنے کے لائق تو ہو ہی گئی تھی۔ شوبھا بہت افسردہ ہوگئی اور سوچنے لگی۔ بھگوان آج کیسی باتیں بچوں کے منہ سے سنوار رہا ہے۔ بچی کو خاموش کرنے کے لئے شوبھا نے مسکان کو پیار کرتے ہوئے کہا۔ تو تو ہماری بہت پیاری سی بچی ہے۔ آشا دیدی مذاق کر رہی ہونگی۔''

اوشا بھی محسوس کرتی تھی دوسرے بچے مسکان کو پسند نہیں کرتے ہیں۔ اوشا نے آشا کو ڈانٹا تو اس نے فوراً جواب دی۔ ممی مجھے اچھے سے معلوم ہے کہ ہم سب سگے بھائی بہن ہیں۔ اس وقت تو اوشا نے آشا کو سمجھا دیا لیکن بچوں کے روز روز کے

سوال سے اوشا لاجواب ہو جاتی تھی۔ اکثر اوشا سوچتی مسکان کو دے کر ہم نے کوئی غلطی تو نہیں کی۔ ظاہر تھا کہ مسکان کے سامنے اس کے دوسرے بچے اپنے کو کم تر سمجھتے تھے۔ اوشا کے ذمہ چار بچوں کی پرورش تھی اس کا شوہر وکیل تھا۔ نہ زیادہ پیسے اور نہ زیادہ وقت وہ بچوں کو دے پاتی تھی۔ جو سب کچھ مسکان کو مل رہا تھا۔ مسکان کی ہر سال زبردست قسم سے سالگرہ منائی جاتی تھی۔ طرح طرح کے کھلونے اور کپڑے اور مٹھائیوں کی بھرمار ہو جاتی تھی لیکن اوشا اپنے بچوں کی سالگرہ نہیں منا سکتی تھی۔ وقت کے ساتھ بچوں کے دماغ میں بغاوت پیدا ہو رہی تھی۔ اوشا نے تو سوچا تھا کہ بھابھی کی گود بھی بھرے گی اور اسے ایک بیٹی کی ذمہ داریوں سے الگ ہو جائیگی لیکن یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور ہو گیا تھا۔ بچوں کے سوال کے جواب دے دے کر اوشا بے چین ہو جاتی اور ایک دن اس نے اپنے شوہر کو سب باتیں بتائیں اور اپنی ذہنی پریشانیوں کا بھی ذکر کیا۔ منوج سب باتیں سن کر پریشان ہو گیا۔ نہ مسکان کو بہن کے پاس سے بلا سکتا تھا اور نہ بچون کو سمجھایا جا سکتا تھا۔ عمر کے ساتھ بچوں کے سوالات بھی بڑے ہو رہے تھے۔

آخر ایک دن منوج نے سب بچوں کو اپنے پاس بلایا اور ان لوگوں کو سمجھانا شروع کیا۔ منوج نے کہا۔

"تم لوگ مسکان سے مقابلہ کرتے ہو تم لوگوں کے پاس تمہاری سگی ماں ہیں۔ جو مسکان کے پاس نہیں۔ منوج نے کئی کتابیں بچوں کو دکھائیں اور بتایا۔ دنیا کے کونے کونے میں اپنی ماں کی اہمیت سب سے بڑی دولت سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ ہر مذہب اور ہر دھرم میں ماں کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ انسان کی سب سے بڑی دولت اس کی ماں ہوتی ہے۔ بھگوان نے ہاتھ پیر دئے ہیں محنت کرو اور دولت کے پیچھے مت بھاگو۔ کہو تو تم سب لوگوں کو شوبھا پھوا کے پاس بھیج دوں۔ وہاں ہر

طرح کا آرام مل جائے گا لیکن ماں کو چھوڑنا پڑے گا۔ یہ سوچ لو۔ دو تین گھنٹہ منوج نے بچوں کو اس پیار سے مذہبی کتابوں کو دیکھا کر بتانے کی پوری کوشش کی کہ تم لوگ خوش نصیب ہو جو اپنی ماں کے پاس ہو۔ اب فیصلہ تم لوگوں کے پاس ہے ماں کے پاس رہنا پسند کرو گے کہ پھوا کے پاس۔ وہاں ہر طرح کا آرام ہوگا شوق پورا ہوگا۔ یہاں بھرا پورا گھر ہے تمہارے ماں باپ اور بھائی بہن ہیں۔ وہاں یہ سب نہیں ملے گا یہ سوچ لو۔

سب بچے اوشا کے پاس آکر سٹ گئے۔ نہیں نہیں ہم لوگوں کو اپنی ماں چاہئے اور کچھ نہیں۔ ہم لوگ اپنی ماں کو نہیں چھوڑ سکتے ہیں۔

اس دن کے بعد اوشا کے کسی بچے نے ماں سے مکان کی خوش نصیبی اور اپنی تکلیفوں کا رونا نہیں رویا۔ اوشا کو سکون مل گیا۔ کون سا جادو منوج نے چلایا کہ سب بچے خاموش ہو گئے۔ شاید وکالت کا جادو۔

چکلے والی کوٹھے والی

میں بہت چھوٹی تھی اُس وقت کچھ چیزیں مجھے عجیب سی لگتی تھی۔ ٹھیک ہمارے گھر کے سامنے کوٹھے پر کچھ عورتیں رہتی تھیں جو دن میں سورج کی روشنی میں کوئی خاص نہیں لگتی تھیں لیکن رات کے وقت بجلی کی روشنی میں وہ چمکنے لگتی تھی۔ شام ہوتے ہی وہ بن، سنور کر اپنی بالکونی میں بڑی ادا کے ساتھ بیٹھ جاتی تھیں۔ ہم بچوں کو اس طرف دیکھنے کا حکم نہیں تھا حالانکہ ہم لوگوں کو وہ چمکتی ہوئی عورتیں بڑی بھلی لگتی تھیں اور گھر کے بزرگوں کی نظروں سے بچتے بچاتے ہم لوگ اُدھر دیکھ ہی لیتے تھے۔ وہ کون ہیں اور کیوں بیٹھتی ہیں۔ یہ سب سمجھنے کی ضرورت تو تھی نہیں بس ان لوگوں کو دیکھنے کی خواہش ہم لوگوں کو ادھر متوجہ کر دیتی تھی۔ جب کوئی مردان لوگوں کی طرف نظر اٹھا کر

دیکھتا تھا وہ خوش ہو جاتیں اور کوئی آ جاتا تو وہ استقبال کرتی تھیں۔ ہم بچے ان عورتوں کی تعریف کرتے کہ کتنی خوش اخلاق عورتیں ہیں مہمان کو دیکھ کر وہ منہ نہیں بناتی ہیں۔

ایک دن ہم لوگوں کی بوا کے بیٹے حفیظ کو بلا کر ان عورتوں نے حلوہ پوری بازار سے منگایا اور اسے پانچ روپیہ کا ایک نوٹ اور سر میں دینے کی تیل کی شیشی دیا۔ حفیظ نے ہم لوگوں کو بتایا ان عورتوں کے سر کے تیل کے خوشبو کی تعریف کیا تو ان لوگوں نے مجھے یہ تیل کی شیشی پکڑا دیا۔ حفیظ نے تیل کی شیشی ہم لوگوں کو تحفہ میں دے دیا۔ اس نے کہا عورتوں کا خوشبودار تیل آپ لوگ لگائیں۔" ہم سب بہنوں کو بھی اس کی خوشبو نے اپنی طرف متوجہ کر لیا اور ہم بہنوں نے بڑے شوق سے اس تیل کا استعمال کیا۔ جس کی خوشبو ہر جگہ پھیل گئی۔ کچھ سمجھ میں اس وقت نہیں آیا لیکن سب ماؤں نے وہ پٹائی کی چکلے والی کے یہاں کا تیل لگا کر خوش ہو رہی ہے بے شرم"

کچھ سمجھ میں تو آیا نہیں۔ یہ چکلے والی کون ہوتی ہے اس کے گھر کا خوشبو تیل ہم لوگوں کے مار کھانے کی وجہ کیوں بن گئی۔ بڑی ہونے کے بعد اصلیت سمجھ میں آتی ہے۔

بالکونی میں بیٹھنے والی ایک عورت کا ایک بیٹا بھی تھا جو اکثر ہم لوگوں کے گھر میرے بھائیوں کے ساتھ کھیلنے کے لئے آ جاتا تھا۔ ہمارے گھر کے پرانے بہی خواہ ہنگو میاں کو وہ لڑکا پھوٹی آنکھ نہیں بھاتا تھا۔

ہمارے نانا جان۔ ماموں جان اس لڑکے کے آنے پر روک لگانے کے لئے کہہ چکتے تھے۔ ہنگو میاں کہنے کو تو ہمارے گھر بہت ہی پرانے نوکر تھے پر تھے بہت سخت ہم بچے ان سے اس قدر ڈرتے تھے کیونکہ وہ چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر خود بھی ڈانٹ پلاتے اور بزرگوں سے پھٹکار لگواتے تھے۔

ہم سب لوگ مل کر چھوٹے چھوٹے مشاعرے کرواتے۔ پیسے جمع ہوتے اور

چھوٹے چھوٹے شاعر آتے۔ گھر کے بزرگ بھی حصہ لیتے۔ چائے اور ناشتے کا بھی ہم لوگ انتظام کرتے تھے۔

بالکونی والی عورت کا بیٹا اختر اکثر آتا تھا۔ مشاعرے میں وہ ہم سب لوگوں کے ساتھ انتظام میں لگا ہوا تھا کہ اچانک ہنگو میاں کی گرجدار آواز سے ہم سب تھرا گئے۔ لڑکا یہاں کس لئے آتا ہے وہ اختر کی طرف اشارہ کر کے بولے۔ شریفوں کے یہاں کوٹھے والیوں کے بچے سرکار نے (ہمارے نانا جان کو سرکار کہا جاتا تھا) اجازت نہیں دیا ہے۔

تم فوراً یہاں سے جاؤ، ہنگو میاں نے اختر کی طرف اشارہ کیا یہ شریفوں کی محفل ہے۔ شریفوں کے بچے رہتے ہیں ماں کی ناجائز اولاد کا یہاں کیا کام۔ سب لوگ ہنگو میاں کو منع کرنے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ کہاں ماننے والے تھے جملہ مکمل کر ہی دیا۔

سب باتیں سن کر اختر کا چہرہ نیلا ہو گیا وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو کی دھار بہہ نکلی اور وہ تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ سب لوگ اسے پکارتے رہے لیکن وہ نیچے اُتر گیا تھا۔ سب لوگوں پر اس کا بہت اثر ہوا۔ ہنگو میاں کو بھی لوگوں نے کہا کہ وہ معصوم سا بچہ ہے اسے اس طرح سے کہنا بہت غلط تھا۔ مگر ہنگو میاں سر اُٹھا کر بولے ''بہت دنوں کا غصہ آج نکل گیا''۔

مشاعرہ کا ماحول پھیکا ہوا ہم سب لوگوں کے چہرے اتر گئے۔ اس حادثے کے بعد پھر ہم لوگوں نے اختر کو نہ بالکونی میں دیکھا اور نہ محلے میں۔ شاید اسے سخت شرمندگی اور بے عزتی ہوئی اور اس نے شہر چھوڑ دیا۔ ابھی بھی سوچتی ہوں تو آنکھیں بھر جاتی ہیں۔ بیچارہ اختر خدا معلوم کہاں چلا گیا۔

قریب تیس چالیس سال گذر گئے میں کسی سلسلے میں بمبئی گئی ہوئی تھی کہ اچانک

میری نگاہ اختر پر پڑی۔ اتنے دنوں کے بعد شکل تو یاد نہیں تھی لیکن اندازے سے مجھے ایسا لگا کہ یہ شخص اختر ہی ہے میں نے معافی مانگتے ہوئے پوچھ لیا کہ کیا وہ اختر ہے۔

اس شخص نے فوراً جواب دیا ''ہاں میں اختر ہوں'' معلوم ہوا کہ اختر اس وقت بمبئی کا بڑا ڈاکٹر ہے۔ وہ شخص خلوص سے ملا ہی نہیں اپنے فلیٹ پر بلایا بھی اور میں گئی بھی۔ خوبصورت سا سجا ہوا فلیٹ اور اس کی خوبصورت سی ڈاکٹر بیوی رخسار سے بھی ہم لوگوں کی ملاقات ہوئی۔ خوب خاطر کیا ان لوگوں نے۔

اختر نے کہا ''میں کبھی نہیں چھپاتا ہوں کہ میں ایک کوٹھے والی چکلے والی کا بیٹا ہوں۔ میری ماں سے پتہ نہیں کس مجبوری کے لئے اس خاندانی پیشہ کو کیا لیکن میری ماں نے مجھے اچھی تعلیم اچھی سوسائٹی دیا۔ دنیا کے طعنوں سے تنگ آ کر میری ماں نے مجھے بورڈنگ اسکول میں رکھا۔ چھٹیوں میں وہ خود میری ماں میرے پاس آ جاتی تھی۔ دنیا کی نظروں سے مجھے دور رکھا۔ آج میں جو ہوں اپنی ماں کی وجہہ کر ہوں ورنہ بے عزتی کی زندگی تو مجھے برباد ہی کر دیتی۔ میں اپنے باپ کو نہیں جانتا اور جاننا بھی نہیں چاہتا اس لئے میں نے ہر جگہ اپنی ماں کا نام ہی دیا۔ آج میری ماں اس دنیا میں نہیں ہے۔ مگر میں ہمیشہ ان کو یاد ہی نہیں کرتا بلکہ ان کے نام سے ایک مدرسہ بنا دیا ہے جہاں اسی طرح کے بچے عزت سے تعلیم حاصل کر رہے ہیں جن کے کسی گارجین کا پتہ نہیں ہو۔''

یہاں بھی بدنامی سے میری ماں کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ ایک صاحب جو پٹنہ کے رہنے والے تھے۔ میری ماں کے ماضی سے واقف تھے دوسروں کو بھی باخبر کر دیا۔ لوگوں کے سوال سامنے آئے مگر ہم دونوں ماں بیٹے نے ایک خاموشی اختیار کر لی اور رفتہ رفتہ لوگ بھی خاموش ہو گئے۔

ہم لوگ اختر کا منہ دیکھ رہے تھے تو اس کی عمر قریب پچاس سال ہو گئی۔ بال

سفید ہونے لگے ہیں لیکن آواز میں کھنک ہے مستقل مزاجی ہے۔ اختر نے گفتگو کا سلسلہ قائم رکھا۔

اختر نے بتایا کہ وہ روز غریب مریضوں کا علاج ہی نہیں کرتا بلکہ انہیں دوا بھی فراہم کراتا ہے۔

ہمارا چہرہ شرمندگی سے جھک گیا یہی لڑکا ہے جسے کس قدر بے عزت کر کے ہمارے گھر سے نکالا گیا تھا۔ ہم نے دیکھا اختر نے اپنے کمرے میں اپنی ماں کی خوب بڑی سے تصویر اپنے بیڈ کے سرہانے لگا رکھی ہے۔

اختر نے بتایا اس کے دو لڑکے ہیں اور دونوں ڈاکٹری پڑھ رہے ہیں اور اچھے طالب علم ہیں۔

اختر نے اپنی مصروفیت کے باوجود ہم لوگوں کو وقت دیا سب کی خیریت پوچھا۔ اس کی بیوی رخسار بھی بہت خلوص سے پیش آئی۔ وہ بھی شہر کی ایک اچھی ڈاکٹر ہے۔

آخر میں ہم لوگوں کے منع کرنے کے باوجود اختر اپنی بڑی سی گاڑی سے ہم لوگوں کو ہوٹل چھوڑ گیا جہاں ہم لوگ ٹھہرے ہوئے تھے۔ بار بار گھر آنے کے لئے کہا۔ ہمیں اپنے گھر میں ٹھہرنے کی التجا کرتا رہا۔

قاتل

گوری کا مردہ جسم سامنے پڑا تھا۔ نزدیک ہی اس کی بڑی لڑکی ڈولی سہمی سہمی سی بیٹھی تھی گو اس معصوم کو نو سال کی عمر میں گھر کی ذمہ داریاں اُٹھانی پڑینگی۔ ان ذمہ داریوں نے ڈولی کو سنجیدہ بنا دیا تھا۔ گوری کئی ماہ سے بیمار تھی۔ اسے گھر کے کام اور چھوٹے چھوٹے بھائی بہنوں کی دیکھ بھال اچھی طرح کرنے لگی تھی۔ ماں کی لاش کے

پاس اس کا چھوٹا بھائی پپّو اور دونوں چھوٹی بہنیں گڈی اور چنّی کبھی ماں کی طرف خاموشی سے دیکھ رہی تھیں ان معصوم بچوں کو یہ سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا کہ آخر اس کی ماں اُٹھ کیوں نہیں رہی ہے۔

ڈھائی سال کی ڈبو کو اپنے بھاری پیٹ اور بھاری سر کی وجہ کر چلنا پھرنا ہی مشکل ہے کھانے کے لئے بار بار مانگ رہی ہے۔

یہ چھوٹی موٹی بچوں کی فوج ماں کے مردہ جسم کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھے جا رہی تھی۔ کچھ رشتہ داروں اور کچھ محلے والوں کی مدد سے گوری کے آخری سفر میں لے جانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ ڈولی کو چھوڑ کر کسی بچے کو موت اور زندگی کا فرق پتہ نہ تھا۔

کھانا کیوں نہیں بن رہا ہے۔ پاپا آفس کیوں نہیں گئے۔ گھر میں ایسی خاموشی کیوں ہے۔ سب باتیں بچے جاننا چاہتے تھے پر ان کو کون سمجھائے۔

گوری کو جس دن یہ محسوس ہوا کہ وہ ساتویں بچے کی ماں بننے والی ہے۔ تو وہ رو پڑی تھی اس کا پتی موہن بڑے پرانے خیالوں کا مالک تھا نہ آپریشن کرانا اور نہ کروانا چاہتا تھا۔ گوری کو بھی اس نے اس قدر دبا کر رکھا تھا کہ وہ بھی اپنے سے کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی تھی۔ کچھ تو شوہر کا ڈر اور کچھ بھگوان کا ڈر اسے ہمیشہ روک دیتا۔ وہ اچھی بیوی کی طرح گھر گرہستی کرتی رہی اور ہر ڈیڑھ دو سال میں ایک بچہ بھی پابندی سے پیدا کرتی رہی۔ چودہ سال میں بچوں کی چھوٹی موٹی فوج تیار ہو گئی ہے۔

موہن کی آمدنی کم اور وقت کی کمی نے گوری کی پریشانی کی طرف دیکھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ دن بھر محنت کرتا اور کھانا کھا کر بے فکر سو جاتا جیسے بیوی بچے کے لئے کھانا کپڑے کی ذمہ داری ہی اس کی ذمہ داری تھی۔ موہن اور گوری دونوں مشین تھے۔ موہن کا کام کھانا اور گوری کا کام گھر چلانا۔

جب پندرہ سالوں قبل گوری جب شادی کر کے اس گھر میں آئی تھی تو ہر شخص اس کی پیاری سی شکل کو دیکھ کر تعریف کرتا مگر پہلی اولاد سنیل کی پیدائش کے وقت اس کا نقشہ

بدلنے لگا نہ اچھا کھانا اور نہ آرام۔ پھر سنیل کے بعد انیل کی پیدائش ہوئی گوری کی شکل بدلنے لگی۔ لگا تار بچوں کی پیدائش سے گوری کو چڑ چڑا بنا دیا تھا۔ موہن بھی چڑ چڑا ہوتا جا رہا تھا۔ آفس میں فائل کے ساتھ سر پھوڑنا۔ بوس کی ڈانٹ کھانا اور گھر آ کر گوری کی تیکھی باتیں برداشت نہیں ہوتیں۔ گھر میں آفس کی فکر اور آفس میں گھر کی پریشانیاں یاد آتیں۔ آفس کا غصہ موہن گھر میں بیوی بچوں پر نکالتا۔ بچے باپ کو دیکھ کر ڈر جاتے گوری منہ بنا لیتی۔ کم آمدنی کی وجہ کر بچوں کی تعلیم بھی ٹھیک نہیں ہو رہی تھی۔

گوری کو موہن کے ساتھ اپنی ساس سے بھی نفرت ہوتی جا رہی تھی جو بچوں کو بھگوان کی دین کہتی تھیں۔ گوری کی ساس تو گھر کے ہنگامے سے تنگ آ کر چھوٹے بیٹے کے پاس چلی گئیں لیکن گوری کو اس جنجال میں چھوڑ گئیں۔ موہن گھر کا ماحول گرم دیکھتا تو فائل دبا کر گھر سے نکل جاتا اور دیر رات لوٹ کر آتا۔ وہ اس ماحول سے خود تو نکل جاتا۔ بیچاری گوری کہاں جاتی گھر کو چھوڑ کر۔ ممتا کی ماری ماں گوری بچوں کو اچھے سے رکھنا چاہتی۔ اچھا پہنانے، اچھا کھلانے اور اچھی تعلیم دینا چاہتی پر کچھ ممکن نہ دیکھ کر وہ رو پڑتی۔ اتنی مصروفیت کے باوجود وہ محلے کے کپڑے سیتی۔ سویٹر بن کر چار پیسے کما لیتی لیکن ساس کے خلاف زبان کھولنے کی ہمت نہیں کرتی پھر بھی وہ بچوں کی ہر ضرورت پورا نہیں کر پاتی۔

ساتویں بچے کی پیائش اس کے لئے منحوس ثابت ہوئی۔ اس کی طبیعت بہت خراب ہونے لگی تھی۔ بچے کے پیدائش سے قبل حمل ختم کرانے کے لئے اس نے اپنی ساس سے بہت کہا پر وہ مہاپاپ کہہ کر ٹال گئیں۔ اچانک گوری بے ہوش ہوگئی اس کی حالت خراب ہوگئی تھی اس قدر کمزور ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر ضرور آئے لیکن اس بے جان سی عورت کے جسم میں کوئی جان نہ پھونک سکا۔ پانی اور خون چڑھانے پر گوری کی حالت بگڑتی چلی گئی اور پھر ڈاکٹر نے آخر اُسے مردہ قرار دیا دیا۔ موہن چلا چلا کر رونے لگا میں قاتل ہوں، میں قاتل ہوں، قاتل، مجھے سزا دو!

حسب نسب

ایک دو ڈھائی سال کی بچی ۱۹۴۸ء کے ہندو مسلم فساد کے بعد تلہار بستی (جو پٹنہ ضلع کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جہاں ۱۹۴۸ء کے قبل مسلمانوں کی گنجان آبادی تھی) میں ایک جھاڑی میں محبوب صاحب کو ملی وہ خون سے سندی ہوئی تھی مگر ہلکی سی سانس چل رہی تھی۔ محبوب صاحب جو اپنے رشتہ داروں کا پتہ لگانے گئے تھے۔ انہوں نے بچی کو فوراً اسپتال میں بھرتی کرا دیا۔ بچی خون سے سنی ہوئی تھی اور بہت جد و جہد کے بعد بچی تو بچ گئی لیکن چھوٹی بچی کچھ بتانے کے لائق تو تھی نہیں۔ محبوب صاحب نے کوشش کر کے اس بچی کو گود لے لیا حالانکہ ان کے پاس اپنے کئی بچے تھے لیکن محبوب صاحب نے اسے اپنی بیٹی کا مقام دیا اس بچی کا نام صوفیہ رکھا۔ محبوب صاحب نے سرکاری عملے کے حوالے کرنا بہتر نہیں سمجھا۔ دو ڈھائی سال کی بچی ابا امی تو بول لیتی تھی لیکن اپنا نام نہیں بتا سکتی تھی۔ محبوب صاحب نے بچی کی تصویر اخبار میں دیا اور والدین کا پتہ لگانے کی پوری پوری کوشش کی لیکن وہ ناکامیاب رہے۔ آخر محبوب صاحب نے اسے اپنے گھر میں رکھنا بہتر سمجھا۔ کسی نے بچی کے بارے میں پتہ لگانے کی کوشش نہیں کی جس سے یہ محسوس ہوا کہ بچی کے خاندان کے سب لوگ شہید ہو چکے ہیں۔ تیلہار بستی ایسی بستی تھی جہاں کے کل مسلمان شہید ہو گئے تھے۔ بستی میں منحوسیت چھا گئی تھی۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ مسجد میں کوئی نہیں رہتا لیکن پانچوں وقت کی آذان آتی تھی بلکہ کچھ لوگ تو کہتے تھے کہ بغیر سر والے لوگ نماز کے وقت نماز ادا کرتے دیکھے جاتے تھے بات کہاں تک سچ ہے یہ تو خدا جانتا ہے لیکن پوری بستی بھوت کا اڈا بن گئی۔ مسلمان شہید ہو گئے تھے اور غیر مسلموں نے بھی بستی چھوڑ دیا ہلکی سی آواز آتی تو لوگ چونک جاتے تھے۔ برسوں بعد حالات پرانے معمول پر آنے لگے اور بستی میں کچھ

پرانے لوگ اور کچھ آس پاس کی بستی کے لوگ آ کر بسنے لگے۔

اِدھر صوفیہ محبوب صاحب کے یہاں دوسرے بچوں کے ساتھ پرورش پانے لگی۔ محبوب صاحب اور ان کے خاندان کے لوگ صوفیہ کو پیار کرتے تھے۔ اس کا داخلہ بھی اسکول میں ہو گیا۔ سب لوگ صوفیہ سے ہمدردی رکھتے جس کا کوئی اپنا نہیں تھا۔ یہ واقعی میں پیار کی مستحق تھی۔ صوفیہ کو دوسرے بچوں سے کم نہیں سمجھا جاتا۔ لوگ کھلونے اور کپڑے اس کے لئے لاتے۔ صوفیہ نے بھی اسکول کی تعلیم حاصل کی اور پھر کالج میں بھی داخلہ ہو گیا۔ صوفیہ گھر کے فرد کی طرح گھر کے ہر کام میں حصہ لیتی اور سب کا خوب خیال کرتی تھی۔ وہ اچھے صورت شکل کی تھی ہی رہن سہن نے اسے اور بھی نکھار دیا۔ لمبا قد، گورا رنگ اور اچھا ناک نقشہ، سلائی، پڑھائی کھانا بنانے میں وہ کافی دلچسپی لیتی تھی۔ بڑی ہوتے ہی صوفیہ کی کئی منسوب آنے لگے لیکن محبوب صاحب نے صوفیہ سے اس کی رائے لینا ضروری سمجھا۔ صوفیہ ان سب کو ٹالتی رہی کچھ نہ کچھ بات بنا کر منسوب کے لئے منع کرتی رہی اور اس طرح سے صوفیہ کی عمر بائیس سال ہو گئی۔ محبوب صاحب اور ان کی اہلیہ نے صوفیہ کے ذہن نشیں کرا دی تھی کہ وہ ان کی اولاد نہیں ہے گود لی ہوئی بچی ہے۔ ایک دن تو صوفیہ نے ایک ایسا ذیحانذ کر دیا کہ سب لوگ تعجب میں پڑ گئے۔ محبوب صاحب کے تین بیٹے تھے سب خوبصورت اور اچھی سروس میں تھے۔ صوفیہ نے ایک رشتہ دار کے ذریعہ اپنی خواہش کا اظہار کر دیا تھا کہ وہ محبوب صاحب کے بڑے بیٹے محمود کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی۔ سن کر محبوب صاحب اور ان کی اہلیہ تعجب میں پڑ گئے۔ صوفہ کی ہمت پر انہیں تعجب ہوا۔ اپنا بنا کر صوفیہ کو ضرور رکھا تھا پر اس حد تک نہیں کہ وہ اس کو اپنی بہو بھی بنالیں۔ محبوب صاحب اور ان کی اہلیہ نے صوفیہ سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اس حد تک نہ جائے کہ وہ لوگ اس کو اپنی بہو بنانے کو سوچ سکتے ہیں۔ محبوب صاحب کی اہلیہ تو سخت ناراض ہو گئیں۔

خدا معلوم کون سے خاندان کون سی ذات سے اس بچی کا واسطہ رہا ہوگا اور ہماری بہو بننے کا خواب دیکھ رہی ہے۔ محبوب صاحب کی اہلیہ نے کہا کہ مجھے اپنا حسب نسب خراب نہیں کروانا ہے۔ محمود نے بھی صوفیہ سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی لیکن محبوب صاحب اور ان کی اہلیہ نے صاف صاف کہہ دیا کہ اس طرح کی بات وہ کسی بھی قیمت میں نہیں مان سکتے ہیں چاہے اس کے لئے کچھ بھی ہو جائے۔ محمود تو اپنے والد کے سامنے زبان کھولنے کی ہمت نہیں کرتا تھا لیکن صوفیہ نے رو رو کر برا حال کر لیا۔ کھانا پینا چھوڑ دیا لیکن سب بے اثر رہا اور اس درمیان صوفیہ کی منسوب ایک جگہ طے کر دی گئی۔ لڑکا کلکرک تھا محبوب صاحب نے لڑکے کو ایک چھوٹا سا گھر بنا کر دیا اور صوفیہ کو سمجھا بجھا کر شادی کے لئے تیار کر لیا گیا۔ محبوب صاحب نے لڑکے والے کو صوفیہ کی اصلیت بتا دی۔ رو رو کر صوفیہ کی آنکھیں سوج گئی تھیں لیکن گھر کی سکھ شانتی کے لئے وہ خاموش ہوگئی اور شادی کے بعد وہ محمود کی طرف حیرت بھری نگاہ سے دیکھتے دیکھتے رخصت ہوگئی۔ گو صوفیہ نے شادی کے بعد محبوب صاحب کے یہاں آنا جانا چھوڑ دیا۔ اس کا دل ٹوٹ گیا تھا ان لوگوں نے جن لوگوں نے اس کی اصلیت آئنہ کا دیکھا دیا تھا۔ صوفیہ کے دل کو زبردست چوٹ لگی تھی۔

صوفیہ شادی کے بعد اپنے شوہر کے گھر آ تو ضرور گئی لیکن اس کا دل مجروح ہو گیا تھا۔ اس کے حسب نسب نے اس کے ارمان کو روندھ ڈالا تھا۔ اپنے جذبات پر قابو پا کر زندگی تو گذرانے کے لئے تیار ہوگئی تھی لیکن شادی کے صرف تین چار سالوں میں صوفیہ دل کی مریض ہوگئی اور صرف شادی کے چھ سات سالوں میں معصوم بچوں کو چھوڑ کر دنیا سے چلی گئی۔

حسب نسب نے ایک اچھی بھلی لڑکی کی زندگی لے لی۔

بھولی بسری یادیں

نیامت پوری جس کا صحیح نام نعمت پور رہا ہوگا لیکن نیامت پور بولے بولتے اس کا نام نیامت پور ہوگیا ہے۔ یہاں کی زیادہ آبادی تو مسلمانوں کی تھی لیکن وہ دو طبقوں میں بٹی ہوئی تھی۔ پہلا ظالم طبقہ اور دوسری مظلوم طبقہ ظالم طبقہ زمینداروں کا تھا اور مظلوم طبقہ وہ تھا جو ظلم سہنے کی عادی ہو گئے تھے۔ عہدے کے مطابق وہ لوگ منشی، گماستہ، ہراہل اور کمیا کہلاتے تھے۔ عہدے کے مطابق ان لوگوں کے کام بھی بٹے ہوئے تھے۔ یہ سب کچھ تو ہم نے اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا لیکن مجھے ہماری دادی جان نے کچھ اس طرح حالات بتائے کہ ایسا لگا میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے ہی دیکھ رہی ہوں۔ اب سے سو سال قبل کی بات جو ہم نے اپنے بچپن میں دادی جان سے سنی اور محسوس کیا وہ آج بھی ہمارے ذہن میں محفوظ ہے۔ غریب مظلوموں کی زندگی کو ہو کے بیل جیسی تھی۔ وہ زمینداروں کے خریدے ہوئے غلام جسے مجال نہیں جو کسی کام یا کسی بات سے انکار کر دیں۔ خدا رسول کے بعد ان مظلوموں کو زمینداروں کا ڈر رہتا تھا کیونکہ سزائیں بھی وہ لوگ ایسی دیتے جس سے انسانیت شرمسار ہو جائے۔ انگریزوں سے کچھ کم نہیں تھے ان کے مظالم۔

زمیندار لوگ غریب مزدوروں کے بدولت کوٹھی میں بیٹھ کر واج کرتے تھے لیکن خود ان غریب کمیا (مزدوروں) کو دو وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نصیب نہیں ہوتی تھی۔ کام کے بدلے میں ان مزدوروں کو صرف اناج ملتا تھا۔ کام کے مطابق جس سے ان کا گذر ہونا بھی مشکل ہو جاتا تھا۔ ان کمیا لوگوں کی عورتیں بھی زمینداروں کے یہاں جٹ کر کام کرتیں تھے۔ وہ بھی ڈانٹ ڈپٹ کی عادی بن چکی تھیں۔

ان عورتوں کے لئے زبان کھولنا ایک گناہ کبیرہ تھا۔ اس لئے وہ سب خاموشی

سے سب حکم مانتی جاتی تھیں۔ اکھلی کوٹنے سے لے کر جاتا سے پسائی کرنے اور ڈھیکی چلانے کا کام یہی عورتیں کرتیں تھیں۔ کبھی کسی نے زبان کھولنے کی جرات کی بھی تو پھر اسے ایسی سزا ملی کہ دوبارہ زبان پر لگام لگ جاتا ہمیشہ کے لئے۔

گماشتہ اور منشی زمیندار صاحب کے کھیتوں کا حساب رکھتے۔ اناج کا حساب کتاب انہیں لوگوں کے پاس ہوتا۔ مجال نہیں ہے کہ کوئی منشی اور گماشتہ حساب میں کوئی گربڑی کرنے کی ہمت کرلے۔

براہل کھیتوں کی دیکھ بھال کرتے تھے اور مزدوروں سے کام کرانا ان لوگوں کو کام تھا۔ سب مزدوروں کو ان کی محنت کے حساب سے اناج باٹنا وغیرہ وغیرہ براہل کا کام ہوتا۔ زمینداروں کی زندگی بہت عیش سے گذرتی تھی۔

ہماری دادی جان کا بھی خاندان ایک زمیندار خاندان تھا۔ ان کے دادا جان کا نام شجاعت حسین تھا اور انگریز حاکم نے انہیں خان بہادر کا خطاب عطا کیا تھا۔ دادی جان نے مجھے اپنے بچپن کی بہت ساری باتیں کہانیوں کی طرح سناتی تھیں۔ جو آج بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ یہ کہانیوں کو سن کر مجھے اسیا لگتا گویا میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں۔ دادی جان نے بتایا کہ ان کی کچھ سہیلیاں بھی تھیں جو صبح سے شام تک ان تینوں بہنوں کے ساتھ رہتیں۔ (دادی جان تین بہنیں تھیں) یہ سب سہیلیاں غریب گھرانے کی تھیں۔ جو دن بھر زمیندار صاحب کے گھر میں رہنا چاہتی تھیں جہاں ان لوگوں کو پیٹ بھر اچھا کھانا مل جاتا تھا اس کے علاوہ کھیل کے درمیان اور بھی چیزیں کھانے کو مل جاتیں اور وہ سارے پرانے کپڑے بھی جو دادی جان نے پہننا چھوڑ دیا تھا۔ کبھی گڑیا کی شادی اور کبھی چوتھی ہوتی اور گڑیا کے گھروندے میں کھانا پکتا اس ذریعہ سے بھی ان لڑکیوں کو کھانا مل جاتا۔ زمیندار صاحب کے یہاں اناج کی کمی تو تھی نہیں ہماری دادی اماں کوٹھی سے اناج نکلوا کر لے آتیں اور سہیلیوں کے

ساتھ مل کر کچھ نہ کچھ پکتا رہتا۔ گڑیا کے گھروندے میں چھوٹے چھوٹے برتنوں میں کھانا بنتا۔ غریب گھر کی لڑکیاں زمیندار صاحب کی لڑکیوں کی خوشامد میں لگی رہتی تھیں کوئی دوپٹہ ٹھیک کر رہی ہے تو کوئی سر میں تیل ڈال رہی ہے اور دن اسی طرح خوشی خوشی گذرتے رہتے۔

کئی گھر کے مرد تو کلکتہ میں چھوٹا موٹا کام کرتے تھے اور سال میں ایک بار گھر آتے تھے اور بھی زیادہ تر عید یا بقرعید کے موقع پر یا پھر کسی شادی کے موقع پر۔ جب ڈاکیہ کلکتہ سے کسی کے آنے کی خبر کا پوسٹ کارڈ لے کر آتا تو گھر میں خوشی کا ماحول ہو جاتا اور ڈاکیہ کو رو ا (گڑ کی رقیق شے) کا شربت پلایا جاتا۔ پردیسی کے آنے کی خبر سن کر گھر کے ہر فرد کا چہرہ چمک جاتا تھا۔ پکوان بنا کر رکھے جاتے پھر بچیوں کے فراک، بیٹے کے پینٹ اور قمیض، بیوی کی ساری اور پھول بنی کھڑاون لے کر آنے کی خوب خوب خاطر تواضع ہوتی۔ گڑ کے لڈوے بنتے۔ زمیندار رفعت حسین صاحب کی بڑی بیٹی سلمہ۔ دوسری احمدی اور تیسری انوری کی سہیلیاں اپنے ابا کے لائے بسکٹ جس کی شکل جانور جیسی ہوتی چھوٹے چھوٹے پیکٹ تحفہ میں لا کر دیتیں اور نہایت خوشی کا اظہار کرتیں۔ شوہر کے آنے کی خوشی میں عورتیں تیار ہو جاتیں۔ ہر روز ان کی پیشانی پر چاند چمکتا رہتا اور اس طرح ایک ماہ گذر جاتا اور پھر جانے کا دن بھی آجاتا اور گھر کا ہر فرد اُداس ہو جاتا اور جاتے وقت جانے والا اپنے آنسو بہاتا مُچھے میں پوچھتا سامان ہاتھ میں اُٹھائے پیدل اسٹیشن کی طرف روانہ ہو جاتا۔ کچھ دور تو بچے بھی ساتھ جاتے اور پھر پگڈنڈی پر جاتے دیکھتا رہتا پھر وہ ایک سال کے لئے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا اور پھر ایک سال اور انتظار رہتا۔

عورتوں کی تعلیم کا تو اُس بستی میں کوئی رواج نہیں تھا اور خاص طور پر غریب گھر کی لڑکیوں کے لئے تو تعلیم کا کوئی مطلب ہی نہیں تھا۔ ہاں زمینداروں کی لڑکیاں

استانی جی سے ضرور پڑھتی تھیں۔ دادای جان تینوں بہنیں اپنے ابا کے کمرے میں لگی بڑی سی گھڑی کی گھنٹی کی آواز سے تیاری شروع کر دیتیں تھیں۔ تختی کی پالش ہو جاتی جلے ہوئے سقید کوئلے کو چور کر تختی پر ایک لیپ چڑھا دیا جاتا۔ چاول جلا کر اس کی روشنائی بنائی جاتی اور پھر کاڑے کا قلم (بانس کی ایک تپل قسم) کا نوک بنا کر قلم بنا لیا جاتا اور پھر تختی پر لکھا جاتا۔ دادی جان تینوں بہنیں استانی جی کے آنے کے قبل سب تیاری پوری کرتیں۔ اردو اور کلام پاک وغیرہ استانی جی پڑھاتیں جو کسی دوسری بستی کی تھین ان کو الگ ایک چھوٹا سا مکان مل گیا تھا جہاں وہ رہ کر پڑھانے کا کام کرتیں تھیں لیکن صرف زمیندار گھرانے کی لڑکیوں کو سلیٹ کا بھی استعمال ہوتا تھا حساب وغیرہ سکھانے کے لئے۔ بچپن سے ہماری دادی جان کو پڑھنے کا کچھ ایسا شوق ہوا تھا کہ وہ اسّی (۸۰) سال کی عمر تک مطالعہ کرتیں رہیں تھیں۔ موٹے موٹے ناول پڑھتیں۔ محرم میں شہادت نامہ پڑھتیں اور محلے کی عورتیں سنتی تھیں۔ پڑھنے کا یہ شوق اور سنانے کا ان کی زندگی کے آخری دم تک چلتا رہا جب تک ہوش حواس میں رہیں۔ ان کی کتابوں سے دلچسپی رہی بلکہ دوستی رہی۔ وہ کہا کرتیں۔

کتاب مہٖر تم دانا و خوش بیانم

جب دادی جان کے والد صاحب رفعت حسین صاحب کچہری چلے جاتے تینوں بہنیں اپنی سہیلیوں کے ساتھ چھت پر جا کر دوڑ دھوپ کرتیں لیکن دور سے فٹن آتے دیکھتیں تو دوڑ کر نیچے آ جاتیں اور اگر خدا نہ کرے والد صاحب نے دیکھ لیا تو آفت آ گئی۔ دادی جان نے بتایا کہ ایک بار اپنے ابا کے ڈر سے ان کی چھوٹی بہن دن بھر کوٹھیوں کی کوٹھری میں چھپی رہیں، پھر معافی مانگنا پڑا تھا۔

ابا جان کچہری سے کب آئینگے اس کا اندازہ آنگن میں آئی دھوپ سے لگایا جاتا کیونکہ ایک گھنٹے والی گھڑی تھی جو دادا جان کے کمرے میں رہتی اور ان کی غیر

موجودگی میں ان کا کمرا بند رہتا اس لئے آوازیں سنائی نہیں دیتی لیکن آنگن میں آئی دھوپ کو لبالشت سے ناپ کر وقت کا اندازہ لگایا جاتا تھا۔

عید بقرعید کی خوشیوں کا تو کیا کہنا۔ رمضان کے قبل دو مرد اور دو عورتیں کپڑوں کا بڑا بڑا گٹھر ٹھیلے پر لے کر آجاتے۔ مرد مردانے میں اور عورت زنانے میں آتیں اور کپڑوں کی خرید گھر بیٹھ کر ہو جاتی۔ سب لڑکیوں کے کرتے پیجامے کا کپڑا تھان سے پھڑوا لیا جاتا۔ مردوں کے لئے باہر ہی میں کرتے پیجامے کا کپڑا لے لیا جاتا۔ جوتے چپل تو خود زمیندار صاحب شہر سے لاتے تھے۔

دو عدد مقلانی بوا تھیں جو کپڑوں کی سلائی ہاتھ سے شروع کر دیتیں۔ غریب عورتوں اور گھر کی عورتوں کے لئے ساریاں لے جاتیں۔ کام کرنے والوں کے لنگی اور کرتے کا بھی انتظام ہو جاتا اور پھر پورے رمضان میں سلائی کا سلسلہ چلتا رہتا۔ رمضان شریف کے اہتمام بھی خوب ہوتے مسجد میں افطاری جاتی اور غریبوں میں بھی ہر روز تقسیم ہوتی۔ شربت میں تلخہ یا نفیلنگا (تلخہ چاول کا بھات بنا کر لکھا کر پیس کر تیار کیا جاتا ہے) کا شربت بنتا۔ طرح طرح کی چیزیں بنتیں، خوب خوب مزے رہتے۔ سحری میں اُٹھانے کے لئے لائٹیں شاہ۔

لالٹین شاہ، لنگی شاہ، فقیر شاہ پوری بستی میں گھوم گھوم کر لوگوں کو پکارتے۔ رمضان کے آخری روز ان لوگوں کو کپڑے دیئے جاتے۔ الوداع کی رات تو جلوس جیسا نکلتا اور رمضان شریف جانے پر اپنے غم کا اظہار کرتے۔ کچھ اس طرح سے کرتے کہ آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ غریب اور امیر سب اپنے طور پر عید کو پر رونق بنا دیتے۔ پوری بستی میں خوشی کا ماحول رہتا۔ زمیندار صاحب کے یہاں تو مہمانوں کا سلسلہ رہتا۔ ہر طبقے اور ہر ذات کے لوگ عید کی مبارک باد دینے آجاتے اور کئی طرح کی سویاں کھا کر جاتے۔ انگریزوں کے یہاں سے تحفے آتے اور زمیندار صاحب بھی

انگریز افسر کے یہاں کئی طرح کی سویاں بنوا کر بھیجتے۔ میراثی۔ بھانڈ اور شہنائی والے بھی آجاتے۔ بھانڈ تو ایسی ایسی نقل اتارتے کہ دیکھنے والا لوٹ پوٹ ہو جاتا۔ زمیندار صاحب کے یہاں کئی گائے اور بھینس کا دودھ ہوتا جو غریبوں کو عید کے دن صبح مل جاتا۔

انگریزوں کے یہاں سے تحفے آتے تو لوگ بہت خوش ہوتے اور اپنی شان سمجھتے تھے۔

آج جبکہ میری خود کی عمر ستر سال ہو رہی ہے۔ ان بھولی بسری باتوں کو یاد کر کے ایک طرح سے خوشی محسوس کرتی ہوں اور کبھی کبھی ان سب باتوں کو یاد کر کے رو دیتی ہوں۔ کاش وہ دن اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتی۔ دادی جان کے بغل میں لیٹ کر وہ پرانی باتوں، کہانیوں کو خواب میں بھی دیکھ لیتی ہوں۔

انتقام

آج میڈیکل کالج کا سب سے خوبصورت اور ہونہار طالب علم چندر پرکاش عدالت کے کٹہرے میں کھڑا تھا اور وہ بھی اپنی پھوپی کے قتل کے الزام میں ہر شخص کو تعجب معلوم ہو رہا تھا اور ساری عدالت میں موت کی سی سناٹگی چھائی ہوئی تھی۔ جج صاحب نے چندر پرکاش کو مخاطب کر کے کہا

"کیا تمہارا نام چندر پرکاش ہے اور تم میڈیکل کالج کے فائنل ائیر کے اسٹوڈینٹ ہو۔"

چندر پرکاش نے مختصر سا جواب دیا "جی ہاں"

جج صاحب نے پھر کہا "کیا تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہو، تمہیں بولنے کی پوری اجازت ہے"۔

چندر پرکاش نے جواب دیا ''حضور بولنے کا کوئی فائدہ نہیں، میں نے جُرم کیا اور سزا کا مستحق ہوں چاہے جو ملے۔''

جج صاحب نے پھر کہا تمہیں اپنی صفائی میں یا جرم کرنے کی وجہ تو بتانا ہی پڑیگا۔

چندر پرکاش نے کہا ''اگر آپ سنیں تو میں اپنی کہانی سنا سکتا ہوں'' جج صاحب نے کہا ''ضرور ضرور تم بتا سکتے ہو''۔

چندر پرکاش نے کہا، جج صاحب میں نیرج پرکاش کا اکلوتا بیٹا ہوں میرے دادا جی شہر کے اچھے وکیل ہیں اور ان کی آمدنی کافی ہے لیکن میرے پتا جی اس شہر میں ایک چھوٹے سے اسکول میں ٹیچر ہو کر رہ گئے انہوں نے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ ہماری اکلوتی پھوپھی اپنے بیٹے راج کے ساتھ ہم لوگوں کے ساتھ رہتی ہیں۔ ہماری پھوپھی اور ان کے بیٹے راج کی گھر میں پوری اہمیت ہے۔ میری ماں سارے دن گھر کے کاموں میں لگی رہتی ہیں۔ میری ماں کے علاوہ گھر میں کسی کو ہماری فکر نہیں رہتی۔ پتا جی پڑھنے لکھنے میں لگے رہتے اور دادا جی اپنے پیشے میں مصروف رہتے۔ پھوپھی اور دادی تو آپس میں مل جل کر رہیں پر ہماری ماں دن بھر گھر کے کاموں اور ذمہ داریوں میں مصروف رہ کر کمزور ہوتی جارہی تھی مجھے دیکھ دیکھ بڑی فکر ہوتی تھی۔ میں ہمیشہ پڑھائی میں اوّل ہوتا اور راج جیسے تیسے پاس کر جاتا اور اس کی وجہ کر ہم لوگوں میں اور بھی جلن اور نا اتفاقی ہوگئی۔ راج ہر وقت مجھے نیچے دِکھانے کے لئے کوشش میں رہتا۔''

ٹھہر کر کے چندر پرکاش نے پانی مانگا اور پانی پی کر اُس نے اپنی کہانی جاری کردی۔ میں شروع سے پڑھنے میں اچھا تھا۔ میٹرک اور آئی۔ایس۔سی میں بھی اچھا رزلٹ ہوا۔ میں نے میڈیکل پڑھنے کا ارادہ کیا تو پتا جی نے خرچ دینے سے صاف

انکار کر دیا اور دادا جی خوش ہوئے لیکن ہاسٹل کا خرچ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ میں میڈیکل کے امتحان میں نکل گیا لیکن مجھے بڑی محنت کرنی پڑ رہی تھی کیونکہ میں گھر سے کالج آنے جانے میں میرا بہت وقت برباد ہو جاتا۔ پڑھنے کی محنت اور اس پر اخراجات کے لئے دادا جی کے پاس بار بار جانا مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔

میں ڈاکٹر بننے جا رہا تھا لیکن گھر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ دھیرے دھیرے گھر کے ہر فرد سے چڑھ ہوتی گئی یہاں تک کہ اپنے پتا جی سے بھی جو اپنے اسکول کے بعد پڑھتے رہتے تھے ان کو مجھ سے اور ہمارے یہاں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے اسکول جانے اور آنے اور پھر اپنے کمرے میں بیٹھ جاتے۔ ماں کھانا ناشتہ بھی ان کا ان کے کمرے میں دے آتی تھی۔

گھر میں راج کی اتنی زیادہ اہمیت تھی کہ مجھے تو اس کے دیکھنے سے ہی چڑھ ہوگئی تھی۔ میری کسی خواہش کا خیال کسی کو نہیں تھا۔ میڈیکل میں داخلہ ہونے کے بعد میں نے چند دوستوں کو اپنے گھر پر دعوت دیا۔ اس کی پھوپھی راج نے جم کر مخالفت کی۔ ہر بات میں راج مخالفت ہی نہیں کرتا میرا مذاق بھی اُڑاتا۔ پر سب کچھ سہہ کر رہ جاتا۔ میں نے بہت بار اماں سے کہا ہم لوگ الگ گھر میں کیوں نہیں رہتے مگر ماں نے انکار کر دیا کیونکہ پتا جی کی اتنی آمدنی تو تھی نہیں۔

پانچ منٹ تک چندر پرکاش خاموش رہا۔ وہ اپنے آنسو پوچھ رہا تھا اور پھر اس نے بولنا شروع کیا۔ وقت تیزی سے گذر رہا تھا ایک دن میں گھر آیا تو میری ماں بخار سے تپ رہی تھی۔ وہ بہت کمزور ہوگئی تھی لیکن کسی طرح کام کر رہی تھی۔ میں دادی کے پاس گیا اور ان کو بتایا کہ ماں بہت کمزور ہوگئی اسے آرام اور علاج کی سخت ضرورت ہے۔ وہ کام نہیں کر یگی۔ آپ پھوپھی سے کام کرائیں۔ ماں کو دیکھ دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہوتا ہے۔ میں پھوپھی کے پاس بھی گیا ان سے گھر کے کام کرنے کروانے کے

لئے کہا لیکن انہوں نے مجھے دھکّہ دیدیا اور راج بھی آ کر مجھ سے بحث کرنے لگا اور اپنی ماں کی طرفداری میں مجھے دھکہ دیتے ہوئے کمرے سے باہر کر دیا۔ جس میں پھوپھی بھی بیچ میں آ گئی۔ میں نے پھوپھی کو ہٹانے کی کوشش کیا تو وہ ٹیبل پر گر گئیں اور سر پھٹ گیا۔ خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ میں گھبرا گیا اور پھوپھی کو گود میں اُٹھا کر باہر کی طرف جا رہا تھا کہ راج نے مجھے دھکہ دیدیا اور پھوپھی دوبارہ گر گئیں۔ گھر میں ہنگامہ ہو گیا۔ خون زیادہ بہہ گیا اسپتال جا کر کے بھی پھوپھی بچ نہیں سکی۔"

جج صاحب نے اعلان کیا کہ "عدالت کا وقت ہو گیا اس لئے عدالت کل تک کے لئے ملتوی کی جاتی ہے۔" دوسرے دن بھی پوری عدالت بھری ہوئی تھی۔

چندر پرکاش نے کہنا شروع کیا۔ "بھگوان جانتا ہے جج صاحب میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ راج اور پھوپی سے نفرت تو مجھے بچپن سے تھی، لیکن اس طرح کسی سے انتقام لے کر نہیں۔

چندر پرکاش نے پھر سے اپنی بات شروع کی۔ "بچن سے مجھے راج سے چڑھ تھی ہر وہ چیز جو مجھے پسند ہوتی راج اپنا اختیار جما لیتا اور مجھے ذلیل کرنے کی کوئی کثر نہیں چھوڑتا۔ پھر بھی ہم نے یہ ضرور سوچا تھا کہ سمئے آنے پر میں انتقام ضرور لونگا لیکن اس طرح نہیں۔ راج نے بہت مشکل سے صرف بی.اے. تک کی تعلیم حاصل کی لیکن گھر میں اس کی عزت بہت تھی دادی اور پھوپھی کا پیار الگ۔ مخالف پارٹی کے وکیل نے چندر پرکاش کو روکتے ہوئے کہا کہ "الزام تمہارے اوپر ہے کہ تم نے جان بوجھ کر جان لینا چاہا لیکن اس کی ماں بیچ میں آ جانے سے اس کی جان چلی گئی۔ یہ ثابت ہو گیا ہے کہ تم بچپن سے راج سے نفرت کرتے اور اور موقع کے انتظار میں تھے اور موقع ملتے ہی تم نے انتقام لے لیا۔

چندر پرکاش اور اس کے وکیل کی سرکاری وکیل کے آگے کچھ نہ چلی اور چندر

پر کاش کو بغیر ارادہ کے خون کرنے کی سزا مل گئی۔ تین سال قید کی سزا ہو گئی۔ چندر پر کاش اپنی بیمار ماں کے پاس آیا وہ رو رہی تھی۔ یوں تو دادا دادی اور پتا جی سب ہی خاموش اور فکر مند تھے لیکن ماں نے رو رو کر اپنی عجیب حالت کر لی تھی۔

چندر پر کاش کو جب پولس والے لے جا رہے تھے اس کے منہ سے صرف یہی نکل رہا تھا۔ میری ماں کا خیال، رکھنا میری ماں کا خیال رکھنا۔

کلجگی ماں

آج شوبھا نے سو سو روپیہ کے دو نوٹ اپنی ماں کے ہاتھ میں لا کر دیئے۔ جسے دیکھ کر شوبھا کی ماں سہانسی کا چہرا اُتر گیا اور سوالیہ نگاہ سے شوبھا کو دیکھا اور پوچھا کیا یہی آج کی کمائی دو سو روپیہ ہے۔ کیا اس میں سب کا پیٹ بھر جائے گا۔ شپرا اور شبھ راج کی فیس ہو جائیگی۔ تیری کمائی روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے کیوں؟

شوبھا کا باپ بھی دوڑ کر وہاں آ گیا اور چلانے لگا حرامزادی آدھے پیسے خود رکھ لیتی ہوگی۔ پچاس روپئے تو ہمارے اڈے کا خرچ ہے۔ کل کے شراب کا پیسہ بھی ابھی باقی ہے۔ کہاں روزانہ ہزار پندرہ سو لاتی تھی اور کہاں گھٹ کر دو سو ہو گئی۔ کیا بات ہے بتاتی کیوں نہیں؟

شوبھا نے جواب دیا ''پچاس روپئے دلال لے لیتا ہے اس پر بھی بہت خوشامد کرنی پڑتی ہے۔ میں کیا کروں کوشش تو کرتی ہوں کہ زیادہ سے زیادہ کماؤں۔ آپ لوگوں کو تکلیف نہ ہو لیکن میں بھی مجبور ہو جاتی ہوں دلال کے سامنے۔''

قریب دس سال قبل شوبھا اپنے گاؤں سے بھاگ کر بمبئی آئی تھی۔ فلموں میں کام کرنے کے لئے وہ دیکھنے میں خوبصورت تھی اداکاری اور ناچ کا شوق تھا۔ شوبھا اپنے گھر کے ماحول سے بہت تنگ آ گئی تھی۔ گھر میں باپ شرابی گھر آ کر روز

ہنگامہ اور مار پیٹ کرتا۔ تینوں بچے باپ کی شکل سے نفرت کرتے۔ ماں دس گھر کے جوٹھے برتن دھوتی۔ وہاں سے کھانا لاتی۔ سب کے پیٹ کی آگ بجھاتی۔ اس پر شوہر کی مار اور گالیاں ملتی تھیں۔ گھر کا ماحول اس قدر خراب تھا کہ شوبھا نے گھر سے بھاگ جانا ہی بہتر سمجھا لیکن بمبئی کی چکاچوندھ کی اصلیت اسے یہاں آکر معلوم ہوئی۔ رہنے کو تو اس کو چال میں جگہ مل گئی لیکن کھانے کے لئے پیسے چاہئے تھے۔ جو پیسے اپنی سہیلی سے مانگ کر لائی تو جلد ہی ختم ہو گئے کچھ پیسے ماں کے چرا کر لائی تھی وہ بھی جواب دے رہے تھے۔ فلم میں کام تو دور تھا اسے اسٹوڈیو میں گھسنے تک کا موقع نہ ملا اور وہ ادھر اُدھر ماری ماری پھرتی اور چال کی دوسری عورتوں نے اسے وہاں پہنچا دیا جس میں وہ خود مبتلا تھیں اور آخر حالت مجبوری میں اسے کال گرلس بنا کر چھوڑا۔ پہلے دن تو وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی گھر لوٹنا بھی تو مشکل تھا۔ باپ تو اسے کچا ہی چبا جائے گا اور پھر شوبھا نے حالات سے سمجھوتا کرلیا۔ حالات اس طرح چل رہے تھے۔ آس پاس کی ہر نگاہ شوبھا کے جسم کو چیر کر باہر نکلنے کی کوشش کرتی۔ اس شہر میں اکیلی لڑکی کا جینا آسان نہیں تھا۔ لہٰذا اس نے اپنی ماں کو خط لکھ کر یہاں بلا لیا اور پھر ماں باپ چھوٹی بہن شپرا اور بھائی شبھ راج سب آگئے۔ شوبھا نے اپنے آپ کو ایک حد تک محفوظ محسوس کیا لیکن اس پیشے سے وہ نکل نہیں سکی جسے اس نے حالات مجبوری میں اختیار کیا تھا۔ شوبھا کا باپ تو ہمیشہ سے نکما تھا ہی ماں بھی یہاں آکر آرام طلب ہو گئی۔ شوبھا روزانہ ہزار ڈیڑھ ہزار کما کر لاتی اور سب لوگ آرام سے کھاتے۔ شبھ راج اور شپرا کا کارپوریشن [illegible] داخلہ ہو گیا تھا لیکن دس سالوں میں اس کی آمدنی کم ہونے لگی اور تندرسی خراب ہونے لگی۔ [illegible] رہی تھی خوبصورتی میں بھی کمی آگئی تھی اور آمدنی میں بھی۔ دس سال میں سب کی زندگی بہت بے فکری سے گذری۔ پیسے کی کمی کی وجہ کر اس کی ماں میں چڑچڑاپن آگیا تھا وہ شوبھا سے ناراض رہتی اور ایک دن اس نے یہ فیصلہ

کرلیا کہ وہ شپرا کواس کام میں لگادیگی ۔ماں نے اعلان کر دیا اتنے پیسوں میں یہاں رہنا بہت مشکل ہے۔اس لئے اب شپرا کی کمائی سے ہی ہم لوگوں کی زندگی گذر سکتی ہے۔ورنہ بھوک مرنے کی نوبت ہو جائیگی۔ جب تک شبھ راج پڑھ لکھ کر کچھ بن نہیں جاتا۔ جب تک سپرا ابھی شوبھا کی جگہ کما کر لائیگی۔شوبھا پھوٹ کر رونے لگی اور ماں کے آگے ہاتھ جوڑ کر منتیں کرنے لگی۔ ''ماں بھگوان کے لئے ایسا مت کرو۔ شپرا کواس پاپ کی دنیا میں مت ڈالو۔ میں جس طرح ہوگا۔خرچ تم لوگوں کو پورے کرتی رہوں گی۔تم بھی دو چار گھر کام پکڑلو بڑا شہر ہے اچھے پیسے مل جائینگے۔ہم لوگ شپرا اور شبھ راج کو پڑھا لکھا کر پیروں پر کھڑا کر دینگے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا ماں تم ایسا مت کرو۔''

شوبھا کی ماں نے کہا'' تواب بیکار ہوگئی ہے۔ بڑے لوگ گوشت کھا کر ہڈی کوکوڑے پر پھنکوا دیتے ہیں۔ جسے کتا سونگھتا بھی نہیں ہے۔تو ویسی ہی ہوتی جارہی ہے۔

شوبھا نے ماں کی زبان سے اپنے لئے ایسے الفاظ سن کر کانپ گئی اور زور زور سے رونے لگی۔روروکر اس کی طبیت خراب لگنے لگی اور وہ چال میں جا کر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد باہر نکلی تو اس نے صرف شبھ راج کو دیکھا۔پوچھنے پر معلوم ہوا۔ماں بابا شپرا کو لے کر دلال کے پاس گئے ہیں۔شوبھا نے ساری رات رو کر گذاری اور اپنے کئے پر پچھتاوا کر رہی تھی کہ نہ وہ گھر سے بھاگتی اور نہ یہ حشر ہوتا۔دوسرے دن شپرا دو ہزار روپیہ کے نوٹ کے ساتھ دلال کے ساتھ کھولی میں آئی۔ ماں باپ کے چہرے پر خوشی تھی۔دو ہزار دو نوٹ شپرا نے ماں کے حوالے کر دیا لیکن اس کا چہرا اترا ہوا تھا وہ رو رہی تھی لیکن ماں پر اس کا کوئی اثر نہیں تھا۔وہ کھانے کی تیاری میں لگی تھی۔ جب شپرا نے اپنی کتابیں سمیٹ کر اسکول جانے کی تیاری کی تو ماں نے

اسے روک دیا۔ ''رکھ اب کتاب کاپی بہت پڑھائی ہوگئی تو پڑھے گی تو سب کا پیٹ کیسے بھریگا۔ بس شبھ راج کو پڑھنے دے وہ پڑھ لکھ کر کچھ بن جائے ہم لوگوں کی زندگی میں یہی کافی ہے۔ شوبھا کے باپ نے اپنے حصے کے پچاس روپئے لے لئے اور اپنے اڈے کی طرف چلا گیا۔

شوبھا اور شپرا اماں کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔ کیا ماں ایسی ہوسکتی ہے۔ بھگوان نہ کرے کسی کو ایسی ماں اور ایسا بُرا باپ ملے۔ یہ کلجگ کے ماں باپ ہیں۔ دونوں بہنوں کا دل چاہا کہ ماں کا گلا گھونٹ دے۔ باپ کو بازار میں جا کر جوتے لگائے لیکن سب مجبور تھے بہت مجبور۔

شوبھا کی ماں شوبھا سے سخت ناراض تھی وہ بار بار شوبھا کو طعنے دیتی'' گاؤں سے ہم لوگوں کو بلوا لیا اس دن کے لئے اس پر مجھے جوٹھن دھونے کو کہتی ہے۔ اگر جوٹھن دھونا تھا تو گاؤں کے لوگوں کے دھوتی یہاں جوٹھن دھونے آئی ہوں کیا۔

شوبھا کی ماں کو شوبھا سے چڑھ ہوگئی تھی۔ اب وہ شپرا کا خیال کرتی تھی اور وقت سے اسے دلال کے پاس جا کر پہنچا دیتی تھی۔ ہاں سبھ راج کو آرام تھا۔ اچھا اور وقت پر کھانا ملنا اور پڑھائی پر بھی پورا دھیان بھی دیا جاتا تھا۔

دیکھو شپرا کتنے دنوں تک ساتھ رہتی ہے اس کلجگی ماں کے ساتھ۔

دور بہت دور

رات کے گیارہ بج رہے ہیں قمر نے دیوار کی گھڑی پر ایک نظر ڈالی۔ شریش ابھی تک گھر نہیں لوٹا تھا یوں تو سریش کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ قمر بھی دھیرے دھیرے عادی ہوتی جارہی تھی۔ قمر نے کروٹ بدل کر دیکھا اس کے دونوں بچے بے فکر سو رہے تھے۔ اس نے سوچا بچپن کا زمانہ بھی کیا زمانہ ہوتا ہے۔ کوئی فکر اور نہ کوئی

الجھن۔ قمر کو اپنا بچپن یاد آنے لگا۔ وہ کس قدر شریر اور چنچل تھی۔ سب سے شوخ والدین کی دلاری نانا۔ نانی۔ دادا۔ دادی کی بہت پیاری گھر کی پہلی اولاد۔ ممی ڈیڈی کس قدر پیار کرتے تھے۔ ڈیڈی اس کی فرمائش پر نئے نئے کھلونے لاتے۔ ممی پیار سے پیارے خراک بنا دیتی تھیں۔ نانی۔ دادی پریوں کی کہانیاں سناتی تھیں۔

قمر پتہ نہیں کب تک ان خیالوں میں کھوئی رہتی کہ اس کا بیٹا اُٹھ گیا اور پانی پینے کی خواہش ظاہر کی۔ قمر نے اُٹھ کر اسے پانی پلایا، پیا پھر سو گیا۔ اس کے بعد قمر سوئی نہیں وہ کھڑکی کے سامنے کھڑی ہوگئی اور اس کی نگاہ سامنے اپنے گھر کے چھت پر پڑی جس کے لئے اب وہ پرائی ہوگئی تھی گو بچپن میں اس نے اس چھت پر اکثر آنکھ مچولی کھیلا کرتی تھی۔

گو کہ اچھے سے کچھ دیکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن انداز سے اسے لگا اس کی دونوں بہنیں مہر اور قیصر سلائی کر رہی تھیں اور بھابی بھی وہیں بیٹھی تھیں۔ سب لوگ خوش نظر آرہے تھے کہ وہ ان خوشیوں سے دور بہت دور ہوگئی تھی۔ خواہش ہوئی تو وہ اپنے ڈیڈی کو گاڑی سے اترے چڑھتے دیکھ لیتی۔ ایسے انداز سے محسوس ہوتا کہ وہ سست اور افسردہ رہنے لگے ہیں۔ پوری چھت پر نظر دوڑانے پر بھی ممی نظر نہیں آئیں۔ چار سالوں سے اس نے ممی کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ جس ماں کے لئے بے چین رہتی تھی او وہ بھی اسے جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتی تھیں۔ شاید بیمار تھیں۔ ساگ سبزی والیوں سے وہ ہمیشہ اپنے گھر کا حال چال پوچھ لیتی تھی سب کا کہنا تھا کہ قمر کے گھر چھوڑنے کے بعد کسی نے ان کے چہرے پر خوشی نہیں دیکھی۔

قمر سوچتی رہی کہ آخر مجھ کو کیا ملا۔ جذبات کے رو میں بہہ کر اس نے اتنا بڑا قدم اٹھا لیا۔ اپنے آپ سے سوال کرتی مگر جواب نہ دے پاتی۔

اب سے پانچ سال پہلے کی بات یاد آنے لگی۔ قمر جب کالج میں پڑھتی تھی۔ اچھی اسٹوڈینٹ تھی اس نے علم سیاست میں آنرس کیا تھا۔ سریش بھی اس سبجکٹ میں

اچھا طالب علم تھا۔ دونوں ایک ہی کلاس میں ایک ہی سبجکٹ میں تھے۔ اس لئے نزدیکیاں بڑھ گئیں۔ سریش قمر کو پڑھنے میں بہت مدد کرتا۔ دھیرے دھیرے دونوں ایک دوسرے کے لئے پیار محسوس کرنے لگے۔ پڑھائی پوری ہونے کے بعد سریش کی سروس اسی شہر میں لکچرر میں ہوگئی۔ اس نے اپنے سبجکٹ میں ٹوپ کیا تھا۔ قمر کا دوسرا مقام تھا۔ پڑھائی کے بعد بھی دونوں کا ملنا جلنا جاری تھا۔ حالانکہ قمر کے والد کو ان کا ملنا جلنا بالکل پسند نہیں تھا۔ وہ تو قمر کے لئے اچھے لڑکے کی تلاش میں تھے۔ کئی اچھی منسوب قمر کی آئی۔ قمر کے والد صاحب لڑکی کی رائے بھی جاننا چاہتے تھے۔ لیکن یہ جملہ جب قمر کے منہ سے نکلا کہ میں سریش سے کہہ چکی ہوں۔ شادی کرونگی تو صرف سریش سے۔ سن کر یہ جملہ سب کے ہوش اُڑ گئے۔ شروع میں تو لوگوں نے یہ سوچا کہ وہ مذاق سے بول رہی ہے۔ پر جب اس نے بار بار اس جملے کو دہرایا تو سب کی عجیب حالت ہوگئی۔ گھر کا ہر فرد بے چین ہوگیا۔ سب نے اپنے طور پر سے قمر کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن قمر کی ضد کے لئے اس پر پہرے بھی بٹھائے گئے پر سب کچھ بے کار ہو گیا۔ ماں نے ممتا کی قسم دی۔ باپ نے گھر کی عزت کا واستہ دیا۔ بہنوں نے پیار کی دہائی دی لیکن قمر پر عشق کا بھوت کچھ اس طرح سوار تھا کہ اس نے خودکشی کی دھمکی دیدی اور ایک دن ہزار پہرے اور بندشوں کے باوجود قمر گھر سے نکل گئی اور سیدھے سریش کے گھر پہنچ گئی۔ پھر دونوں نے کورٹ میں جا کر شادی رچالی۔ قمر کے گھر میں کہرام مچ گئی۔ باپ مہینوں شرمندگی میں گھر سے نہیں نکلے۔ ماں نے تو جیسے بستر ہی پکڑلیا۔ دھیرے دھیرے حالات معمول پر آ گئے۔

سریش سے شادی کے بعد شروع میں قمر کو بہت اچھا لگا۔ جیسے اس نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہو۔ پر دھیرے دھیرے حالات کا مقابلہ کرنا بھی مشکل ہوگیا۔ سسرال میں تو اس کو آنے تک کا حکم نہیں تھا اور مائکے کے دروازے تو ہمیشہ کے لئے بند ہو چکے تھے۔ سارے دن وہ گھر میں قید رہتی۔ لوگوں سے ملنے جلنے میں اسے شرمندگی

لگتی۔ سریش کے رویے میں دھیرے دھیرے تبدیلی آنے لگی تھی۔ وہ اکثر اپنے والدین سے ملنے جاتا اور وہاں سے آنے کے بعد اس کے مزاج میں چڑچڑاپن رہتا۔ بچوں کو اچھے اسکول میں پڑھانے کی خواہش بھی قمر کی پوری نہ ہوسکی کیونکہ پیسوں کی کمی کی وجہ کر قمر کو بچوں کو معمولی اسکول میں دینا پڑا تھا۔ گو سریش پروفیسر ہو گیا تھا مگر اسے والدین کو سپورٹ کرنا پڑتا تھا چھوٹے بھائی کی پڑھائی کا خرچ بھی وہ اٹھاتا۔ پیسوں کی کمی کی وجہ کر قمر کی سریش سے اس کی بحث ہو جاتی۔ افسوس تو اس وقت ہوتا جب سریش اسے طعنے دیتا کہ وہ بڑے گھر کی لڑکی تھی اسے تو ایک غریب گھر کے لڑکے کا ہاتھ پکڑنا نہیں چاہئے تھا۔ کبھی سریش اس کو بے وفا کے طعنے دیتا کہ وہ جب اپنے ماں باپ کی نہیں ہوئی تو وہ اس کی کیا ہوگی۔ قمر یہ سب سن کر بہت افسردہ ہو جاتی اور اکثر رونے لگتی۔ دونوں بچوں کے نام رکھنے کے وقت بھی سریش کی اس سے خوب بحث ہوئی اور سریش نے اپنی خواہش کے مطابق بیٹے کا نام نریش اور بیٹی کا نام پوجا رکھا۔

قمر اکثر سوچتی کہ آخر اسے کیا ملا۔ نہ کعبہ ملا نہ وصالِ صنم۔ نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے۔

تکلیف تو اسے اس وقت ہوئی جب اسے یہ خبر ملی کہ اس کی دونوں بہنوں کی شادی کافی اچھے گھرانوں میں طے ہو گئی ہے اور شادی کی زور دار تیاری ہو رہی ہے۔ قمر دودھ والی، سبزی والی کو بیٹھا کر اپنے گھر کی ہر بات کرید کرید کر پوچھتی اور رونے بھی لگتی۔

دھیرے دھیرے شادی کا دن نزدیک آنے لگا۔ قمر نے گھر کی گہما گہمی محسوس کیا۔ لوگوں کو خوش و خرم دیکھا۔ گھر کی صفائی، چونا پالش ہو رہی ہے اور ایک دن ایسا بھی آیا کہ گھر کی خوب سجاوٹ بھی ہونے لگی۔ قمر اس خوشی سے دور تھی حسرت سے گھر کو دیکھتی۔ اکثر اس نے سریش کو گھر بدلنے کے لئے بھی کہا۔ یہ کہہ کر سریش نے اس کی اس بات کو بھی ٹھکرا دیا کہ اتنے کم کرایہ پر گھر کہاں ملے گا۔

ڈیڈی کے یہ الفاظ قمر کو یاد آنے لگتے "قمر تم پر بھروسہ کرنے کا یہ صلہ ملا۔ مجھے

تمہارے لئے ہم لوگوں کے دل میں نہ کوئی عزت ہے اور نہ محبت۔ تم سب کو بھول جاؤ۔''

دادی۔ نانا نے بد دعائیں دیں۔ ماں روتی رہیں۔ بہنوں اور بھائی نے دھتکارہ۔ مگر قمر کی ضد قائم رہی۔ کورٹ میرج کے وقت یہ بات طے ہوئی کہ دونوں آزاد اور بالغ ہیں۔ اس لئے اپنے مطابق مذہب اپنا سکتے ہیں۔ پر ان پانچ سالوں میں قمر نے عید بقرعید نہیں منایا مگر سریش ہولی، دسہرہ اور دیوالی میں اپنے بچوں کو لے کر اپنے گھر جاتا اور خوشیاں مناتا۔ قمر گھر میں اکیلی روتی رہتی۔ سب پرانی باتیں قمر کو بار بار یاد آتیں اور وہ روتی۔

قمر نے اپنی دونوں بہنوں کی شاندار شادی کا انتظام دور سے دیکھا جب دونوں بارات دروازے پر لگی تو اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ کاش اس کی شادی بھی اسی طرح ہوتی، کاش وہ بھی دلہن بنتی، کاش اس کی بھی بارات دھوم دھام سے آتی۔

جب قمر کی دونوں بہنیں رخصت ہونے لگیں تب تو قمر برداشت نہیں کر سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ قمر نے اپنے ڈیڈی کو بھی دیکھا۔ ان کا چہرہ ہتاش ملگ رہا تھا۔ لڑکیوں کو عزت کے ساتھ رخصت کرنا کس قدر فخر کی بات ہوتی ہے یہ اس نے اپنے ڈیڈی کے چہرے پر صاف نظر آیا۔

پتہ نہیں وہ کب تک اس خیال میں کھوئی رہتی کہ سریش آ کر کھڑا تھا اس نے طنزیہ لہجے میں کہا کہ ''کیا بڑے لوگوں کے یہاں کی شادی دیکھ رہی تھیں چلی کیوں نہیں گئیں۔''

سریش کا یہ جملہ قمر کو تیر کی طرح لگا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی، خوب روئی اور رو رو کر برا حال ہو گیا اس کے منہ سے صرف یہ نکلا اتنے نزدیک رہ کر بھی میں سب سے دور ہوں بہت دور، دور بہت دور۔

قلم روتا ہے

آج کے اخبار میں رادھا مصرا کے مرنے کی خبر پڑھ کر مجھے ایک حد تک سکون ہوا اور اطمینان بھی ہوا۔ ایک بے چین روح کو سکون مل گیا۔ یوں تو رادھا مصرا سے میری ملاقات پچھلے بیس برسوں سے نہیں ہوئی تھی لیکن ان کے بگڑتے حالات کی خبر مجھے مل رہی تھی۔ جسے سُن سُن کر مجھے بڑی تکلیف ہوتی تھی۔

اب سے قریب اکیس، بائیس سال قبل میری ملاقات رادھا مصرا سے پٹنہ مارکٹ کے گیٹ کے سامنے ہوئی تھی۔ وہ ایک دکان کے پاس ایک اسٹول پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ قبل تو میں نے ان کو پہچانا نہیں لیکن جب نزدیک گئی تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ رادھا مصرا ہی ہیں۔ بال منڈے ہوئے۔ گال دھنسے ہوئے اور دانت باہر کی طرف نکلے ہوئے۔ رنگ کافی سانولا۔ راھد امصرا کو ایسی حالت میں دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مجھے دیکھتے ہی رادھا مصرا مجھ سے لپٹ گئیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ یہاں وہ اپنی بیٹی کے ساتھ آئی تھیں۔ جو بار بار اُن کے آنسو پوچھ رہی تھی اور خاموش رہنے کو کہہ رہی تھی۔ رادھا مصرا کی بیٹی بھی رو پڑی اور بولنے لگی کہ ''ممّی کو جوئیں ہو گئی تھی اس لئے پاپا نے ان کے بال مُنڈوا دیئے۔ ہمارے پاپا یوں تو بہت بڑے پجاری ہیں لیکن انہوں نے میری ممی کو بہت زیادہ تکلیف پہنچائی ہے اور آج یہ حشر میرے پاپا کی وجہ کر ہو گیا ہے۔

''پاپا کے ڈر سے ہم سب بھائی بہن کچھ بول نہیں سکتے ہیں۔ ممی کی زندگی ہمارے پاپا نے برباد کر کے رکھ دیا ہے۔''

میں سوچنے لگی کیا یہ وہی رادھا مصرا ہیں جو ایک اچھی اسٹوڈینٹ کے علاوہ خوبصورت اور اسمارٹ تھیں۔ ایک بار کوئی ان سے مل لیتا تو وہ ان سے متاثر ہو جاتا اور

ہمیشہ تعریفیں کرتا۔ کالج کی ہر تقریب میں رادھا مصرا بڑھ چڑھ کر حصہ لیتیں۔ ڈیبیٹ ہو یا کہانی اور مضمون کا مقابلہ ہو رادھا مصرا بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی اور زیادہ تر انعام حاصل کرتیں۔ رادھا مصرا کے ساتھ لڑکیوں کی ایک فوج رہتی جو ان کی فین تھیں۔ رادھا مصرا ان لڑکیوں سے گھل مل کر باتیں کرتی اور کہانیاں سناتیں اور خوب خوب قہقہے لگاتیں۔ رادھا مصرا جہاں رہتی ماحول خوشگوار ہو جاتا۔ رادھا مصرا رانچی کالج کی جان تھیں۔ ہوسٹل اور کالج دونوں جگہوں میں وہ بہت مقبول تھیں

ہم سب کے امتحان کے پروگرام نکل گئے اور ہم سب ہاسٹل کی لڑکیاں پڑھنے میں مشغول ہو گئے اور ہاسٹل کا ماحول سنجیدہ ہو گیا۔ خاموشی سے سب لوگ پڑھنے میں لگ گئے۔ ایک دن رادھا مصرا کے گھر سے کوئی انہیں لینے آیا اور وہ گھر چلی گئیں۔ پھر دو چار دنوں کے بعد وہ واپس آ گئیں۔ وہ بہت خوش تھیں۔ ان کی شادی طے ہو گئی تھی۔ رادھا مصرا نے ہم لوگوں کو بتایا ان کا ہونے والا پتی بہت خوبصورت اسمارٹ اور انگریزی کا لکچرر ہے اور پٹنہ کے ایک پڑھے لکھے خاندان کا لڑکا ہے۔ رادھا مصرا بہت زیادہ خوش تھیں۔ ہم سب لوگ کو دل بھر کر مٹھائی کھلایا۔

بی.اے. کے امتحان کے بعد رادھا مصرا کی شادی ہو گئی اور وہ پٹنہ چلی گئی۔ پٹنہ میں انہوں نے ایم.اے. بھی کر لیا اور سروس بھی جوائن کر لیا۔ کبھی کبھی وہ مجھے اور اپنی پرانی ساتھیوں کو فون کرتیں اور کبھی کبھی میں خود فون کر کے ان کے حال چال پوچھ لیتی تھی۔ پٹنہ جا کر وہ بہت مصروف ہو گئی تھی۔ چھ سالوں میں ان کے چار بچے ہو گئے تھے۔ بچوں کی دیکھ بھال اور گھر کی ذمہ داری پر سروس نے ان کی مصروفیت بڑھا دی تھی۔

اچانک میری ملاقات قریب پچیس سال قبل جمشید پور میں ایک میٹنگ میں ہوئی۔ ہم دونوں ایک ہی ہاسٹل میں بلکہ ایک ہی کمرے میں ٹھہر گئے۔ رادھا مصرا نے

مجھے اپنے دل کی بہت ساری باتیں بتائیں۔ ان کا شوہر جو اچھے گھر کا اور خوبصورت اور اسمارٹ تھا بہت ہی بے ہودہ، خودغرض اور بدتمیز نکلا۔ اس کا چال چلن بھی ٹھیک نہیں تھا [illegible] بے ہودہ حرکتوں کی وجہ کر رادھا مصرا کو بہت شرمندگی بھی اُٹھانی پڑتی تھی۔

رادھا مصرا کا شوہر اسے پیسے بنانے کی مشین سمجھتا اور گھر کی بہت ساری ذمہ داریاں ان کے سر پر تھیں۔ رادھا مصرا کے پیسوں سے ان کا پتی فائدہ خوب اٹھاتا ہے لیکن ان کو کوئی عزت نہیں۔ اب رادھا مصرا اپنے اس خوبصورت اور اسمارٹ پتی سے سخت بیزار تھیں۔ اکثر ان کا پتی ان کو گالیاں دیتا اور باہر کا راستہ بھی دیکھاتا۔ رادھا مصرا نے بتایا کہ ان کا پتی اچھائی کا ایک مکھوٹا لگا کر جی رہا ہے۔ رادھا مصرا بولتے بولتے خاموش ہوگئیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ انہوں نے بہت سی اپنے دل کی باتیں سنائیں۔

ہم نے رادھا مصرا سے پوچھ لیا۔

''رادھا مصرا آپ تو لڑکے سے شادی کے قبل مل چکی تھیں اور باتیں کر چکی تھیں آپ کو کوئی شک نہیں ہوا تھا کہ وہ کس طرح کا انسان ہے۔

رادھا مصرا نے کچھ دیر خاموش رہ کر مجھے جواب دیا۔ ''بالکل مجھے پتہ نہیں لگا اس شخص نے اچھی طرح بات کیا۔ ہاں بزرگوں کو باتیں کرتے سنا تھا۔ ہماری چاچی نے کہا تھا کہ لڑکا بہت غیر ذمہ دار ہے۔ ہماری بواجی جو شادی کرا رہی تھیں نے جواب دیا۔ شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔

ہمارے چاچا نے کہا'' سنا ہے لڑکے کا چال چلن بھی ٹھیک نہیں ہے''

بوا نے فوراً جواب دیا۔ شادی کے پہلے بہت لڑکے ایسے ہوتے ہیں۔ شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر رادھا مصرا نے کہا'' سوچو شادی

شادی نہ ہوگئی ہر مرض کا علاج ہوگئی۔ حالانکہ بری عادتیں کبھی ختم نہیں ہوتیں اور وہ آج تک ختم نہیں ہوئیں۔''

رادھا مصرا نے بتایا ''شادی تو بہت دھوم دھام سے ہوئی لیکن اس دن سے لے کر آج تک میں خوش نہیں رہی ہوں۔ میرے پتی کو اپنی خوبصورتی اور تعلیم پر بہت گھمنڈ ہے۔ لکچر صاحب لکچرر سے پروفیسر تو ضرور ہو گئے لیکن اپنی ذمہ داریوں سے پیچھا چھڑاتے گئے۔ میری تندرستی خراب ہوتی گئی لیکن کسی کو فکر نہ تھی۔ کماتی اور اخراجات پورے کرتی گئیں۔ بہت ساری ذمہ داریاں مجھ پر آ گئی ہیں اور میری تندرستی روز بر وز خراب ہوتی جا رہی ہے۔ دن رات کی محنت کے بعد نہ آرام ہے اور نہ عزت۔ میرا پتی تو نوکرانی تک کے سامنے مجھے ڈانٹ ڈپٹ کرتا رہتا ہے۔''

میں نے رادھا مصرا سے کہا کہ ''آپ اپنی کہانیاں الفاظ میں کیوں ظاہر نہیں کرتی ہیں'' کچھ تو دل کا بھڑاس نکل جائیگا، اپنی آواز بلند کریں۔'' رادھا مصرا نے کہا اب ہمارے قلم سے خوشی اور قہقہے نہیں نکلتے آنسو نکلتے ہیں۔ میرا قلم آنسو بہانے لگتا ہے۔ اس لئے سب دیکھ کر میں خاموش رہتی ہوں۔ زندگی کا سمجھوتا اسی میں ہے۔ قلم کو بھی خاموش کر دو۔

ایک ہفتہ کا ساتھ رہا رادھا مصرا کے ساتھ اور پھر وہ پٹنہ اور میں رانچی لوٹ آئی۔ پٹنہ سے رادھا مصرا اکثر فون کر کے اپنے دُکھ درد کی کہانی سناتی تھیں اور میں دل مسوس کر رہ جاتی۔ کوئی مدد نہیں کر پاتی تھی۔ سوائے ان کو تسلی دینے کے۔

ساری عمر برداشت کرنا اور شوہر کے گناہوں پر پردہ ڈالتے ڈالتے ان کی تندرستی خراب ہوتی جا رہی تھی۔

پٹنہ سے ہماری ایک ساتھی نے مجھے خبر دی کہ رادھا مصرا بہت بیمار ہیں۔ انہوں نے بستر پکڑ لیا ہے۔ وہ بالکل تنہا ہو گئی ہیں۔ پتی کو ان کی فکر کبھی نہیں رہتی تھی

اور آج بھی وہی حال ہے۔ علاج تو ضرور ہورہا ہے لیکن ذہنی پریشانی اور دلی تکلیف کا نہیں جوان کی خاصی بیماری ہے۔

بیماری میں انہوں نے ایک دن مجھ کو فون کر کے بتایا ''فریدہ میں بالکل اکیلی ہوگئی ہوں۔ دونوں لڑکیوں کی شادی ہوگئی ہے وہ اپنے اپنے پتی کے ساتھ ہندوستان سے باہر ہیں اور بیٹا امریکہ میں جہاں اس نے شادی کرلی ہے اور امریکہ میں ہی رہ گیا ہے۔ میرے پتی کو میری زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے۔ ماں باپ نے برسوں پہلے ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ ساس سسر جو پیار کرتے تھے وہ بھی نہیں رہے۔ پورے خاندان والے اپنے میں مشغول ہیں اور میں بالکل تنہا محسوس کرتی ہوں۔ مجھے طرح طرح کی بیماریوں نے جکڑ لیا ہے اور زندگی کے دن گن رہی ہوں اور پروفیسر صاحب شدت سے میری موت کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں خود بھی زندگی سے ہار گئی ہوں۔ بہت تکلیف میں ہوں بھگوان میری مشکل کو دور کردے۔'' میری دوست میری ہمدرد میرے لئے دُعا کرو بھگوان اس تکلیف سے نجات دے۔

میری خواہش ہوئی کہ میں جا کر رادھا مصرا سے مل آؤں لیکن ایک تو میری مصروفیت اور دوسرے رادھا مصرا کی حالت سن سن کر میری ہمت ان کے پاس جانے کی نہیں ہورہی تھی۔ کیسے میں ان کو ایسی حالت میں دیکھ سکوں گی اور میں نے پٹنہ جانے کا ارادہ ہی ملتوی کردیا۔

آج جب ہم نے اخبار میں رادھا مصرا کے مرنے کی خبر پڑھی تو میرے دل کی عجیب حالت ہوگئی۔ حالانکہ ایک بے چین روح کو ابدی نیند حاصل ہوگئی جس کے لئے وہ بے چین تھیں۔

ہماری ایک ساتھی نے پٹنہ سے مجھے فون کر کے بتایا کہ رادھا مصرا مرنے سے قبل بہت خوش تھیں کہ وہ سہاگن جارہی ہیں۔ جس شخص نے انہیں زندگی بھر رلایا،

تکلیفیں دیں۔ اس کے ہاتھ سے ایک چٹکی سندور مانگ میں بھروانے میں اس قدر خوشی محسوس کر رہی تھیں۔ بھگوان ان کی آتما کو شانتی دے۔

ایک ایسی ہندستانی عورت جو ساری عمر تکلیف میں رہی اس پر وہ سہاگن مرنے میں خوشی محسوس کر رہی ہے۔ سب باتیں سن کر مجھے بہت تکلیف، افسوس بھی ہوئی۔ ہماری ساتھی نے پٹنہ سے مجھے لکھا کہ رادھا مصرا مانگوں میں سندور اور بنارسی ساڑی میں اپنی آخری منزل کی طرف جانے کو تیار ہوئیں تو بہت اچھی لگ رہی تھیں، حالانکہ لگاتار بیماری کی وجہ کر ایک ہڈی کا ڈھانچہ ہو کر رہ گئی تھیں۔ رنگ بھی کالا ہو گیا تھا۔ رادھا مصرا کا پتی البتہ بہت خوش تھا اس عمر میں بھی وہ ایک دوسری عورت کو لاکر پتنی کا درجہ دیگا کہ نہیں، کہا نہیں جا سکتا لیکن دس بہانے بنا کر وہ دوسری شادی ضرور کریگا ۔ چاہے اس عورت کی زندگی کو بھی برباد کیون نہ کر دے۔

خواہش تو ہوتی ہے کہ اس طرح کی عورتوں کی غم کی کہانیاں لکھتی جاؤں پر میرے قلم نے میرا ساتھ دینا چھوڑ دیا ہے۔ غم کی کہانیاں لکھ لکھ کر تھک گئی ہوں اور آنسو بہا رہی ہوں۔ ایسی دُکھ بھری کہانیاں لکھنے میں میرا قلم بھی آنسو سے روتا ہے۔

خواب

طنزیہ افسانہ

اکبر صاحب جب اپنی بیٹی فاطمہ کے منسوب کے سلسلے میں کئی جگہ سے ناکامیاب واپس آئے تو ان کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ چہرا اترا ہوا اور خاموش خاموش سے تھک کر چور ہو رہے تھے۔ اکبر صاحب کی اہلیہ نے خاموش رہنا بہتر سمجھا اور کچھ پوچھا نہیں بلکہ کھانا لگا دیا۔ گھر میں سناٹا تھی دونوں لڑکیاں اپنے کمرے میں پڑھ رہیں تھیں۔ اکبر صاحب نے اوپری دل سے تھوڑا سا کھانا کھایا اور

بستر پر پڑ گئے۔ کچھ ہی دیر میں ان کی آنکھ لگ گئی اور وہ نیند کے آغوش میں چلے گئے اور ان کی اہلیہ بھی سونے کے لئے بھاری قدموں اور بھینگی آنکھوں سے چلی گئیں۔

کچھ دیر میں اکبر صاحب گہری نیند میں چلے گئے وہ چار گھنٹے سونے کے بعد اُٹھنے کے بعد اُنہوں نے اپنے دیکھے ہوئے خواب کا ذکر کرنے لگے۔

اکبر صاحب نے اپنی اہلیہ کو بتایا میں نے عجیب وغریب خواب دیکھا ہے۔ اکبر صاحب نے اپنے ثواب کا ذکر اس طرح کیا۔

میں نے دیکھا ایک وسیع میدان میں ایک میلہ لگا ہوا ہے۔ چاروں طرف دوکانیں ہی دوکانیں۔ ہر دوکان میں چند نوجوان بیٹھے ہیں اور ان لوگوں کی بولی لگ رہی ہے۔ دوکاندار سب کے ڈاک بول رہا تھا۔ بھیڑ کو چیرتے ہوئے اکبر صاحب بھی دوکان پر پہنچ گئے۔ دوکاندار بول رہا تھا یہ دیکھئے اوّل درجے کا لڑکا یہاں پر ہے۔ اچھے داماد خریدنے ہیں تو یہاں دیکھئے۔

یوں تو اس میلے میں آپ کو ہر طرح کے داماد مل جائینگے لیکن ہمارے یہاں کی کچھ اور ہی بات ہے۔ اکبر صاحب نے سوچا اور پھر کہا کہ مجھے اچھا، سستا اور ٹکاؤ مال دکھاؤ میں زیادہ نہیں دے سکتا ہوں۔ کم آمدنی والا انسان ہوں۔

دکاندار نے دیکھانا شروع کیا" یہ دیکھئے اوّل درجے کا مال ہے اس سال امریکہ سے پڑھ کر آیا ہے اور کلکتہ میں انجینئیر ہے۔ ایک لاکھ روپیہ ماہانہ کماتا ہے سب سے بڑی خوبی ہے کہ اس کے ماں باپ نہیں ہیں۔ اس کی قیمت صرف بیس لاکھ ہے۔ گورا خوبصورت ہے اسمارٹ الگ۔

اکبر صاحب نے صاف صاف کہہ دیا میں بھائی میں بیس لاکھ دینے کے لئے تیار نہیں ہوں دوسرا سستا مال دِکھاؤ۔

دوکاندار نے جواب دیا۔ ہاں ہاں صاحب ایسے داماد تو بڑے تجارت پیشہ

اور بڑے افسر ہی لے سکتے ہیں۔خیر دوسرا دیکھاتا ہوں۔

دوسرے نمبر کا لڑا ہے یہ دوکاندار نے کہا۔ایک ڈاکٹر اور ایک انجینیر ہے اچھی سروس ہے۔باپ ہیں ماں نہیں۔خیر اچھا ہی ہے ماں ہوتی تو بہو سے لڑتی جھگڑتی بھی۔دونون لڑکے ملنسار اور ہنس مکھ ہیں۔ہاں رنگ گہرا سانولا تو ضرور ہے رنگ پر نہ جائے دل کا گورا ہے۔یہ دونوں۔

اکبر صاحب نے اس کی تقریر سے گھبرا کر کہا۔دام بولو دام۔دوکاندار نے کہا ''صرف دس لاکھ''۔

اکبر صاحب نے خواہ مخواہ تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو میں سستے پر زور دے رہا ہوں اور تم گراں مال دکھا رہے ہو۔میری صلاحیت بہت معمولی ہے میں ایک پرائیوٹ اسکول میں ٹیچر ہوں اور دو لڑکیاں ہیں کھا پی کر اتنا کہاں بچتا ہے کہ اتنے گراں داماد خرید سکوں۔''

دوکاندار تیسرے نمبر کے داماد کی تفصیل بتانے لگا۔یہ لکچرر ہیں۔پی.ایچ.ڈی کر لیا ہے اور پندرہ ہزار کما رہے ہیں۔بھاری سے بھاری الجبرا اور جومیٹری بنا لیتے ہیں۔سوسو لڑکوں کو ایک ساتھ پڑھا لیتے ہیں۔آپ کی لڑکی کو دھوبی کا گھر کا حساب کتاب نہیں کرنا پڑیگا۔گھر کے غریب ضرور ہیں مگر نام رئیس ہے۔یہ صاحب سسر سے روپیہ لے کر پڑھے۔انگلینڈ جا کر پڑھنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے اسے پانچ لاکھ روپے چاہئے۔

اکبر صاحب گھبرا کر دوسری دوکان پر چلے گئے۔دوکاندار نے پوچھا آپ کو کیسا داماد چاہئے۔

''معمولی بھائی معمولی''

دوکاندار نے کہا کچھ پیسے لگا کر اچھا داماد لیں۔زندگی بھر آپ خوش اور بیٹی

دعائیں دیتی رہیں گی۔قرض لے لیں مگر داماد اچھا خریدیں ورنہ ساری عمر بیٹی شکایت کریگی اور زندگی خراب ہوجائیگی، بڑھاپا خراب ہوجائیگا۔

اکبر صاحب نے جواب دیا" لڑکی کا کیا ہے ہندوستانی لڑکی سب دُکھ سُکھ سہہ لیتی ہے رورو کر بھی جی لیگی۔ بیوی کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر سڑکوں پر گھومنے والا داماد نہیں چاہئے۔صرف کھانا کپڑا دیدے کافی ہے۔

دوکاندار نے کہا ٹھیک ہے۔ یہ دیکھئے صرف لبے.اے. پاس داماد ہے۔ کرانی ہے۔ایک اور ایک سیٹھ کے یہاں لکھا پڑھی کا کام کرتا ہے۔ پانچ چھ ہزار کما لیتا ہے۔ دام صرف دو لاکھ ہے۔آپ کے لائق یہی ہے آپ کے اسٹیمیٹ کے اندر آجائے گا۔صاف صاف بتا دیتا ہوں اس کی کچھ باتیں ۔اس کا دل گھر میں کم اور اِدھر اودھر زیادہ لگتا ہے۔کبھی ہوٹل اور کبھی دوستوں کے یہاں۔ بیوی آجائیگی تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

اور دکھاؤ اور۔ اکبر صاحب نے دوکاندار سے کہا" ہاں ہاں ضرور ضرور" دوکاندار نے کہا میرا کام یہی ہے۔ یہ دیکھئے اس لڑکے کو، صرف آئی.اے. پاس ہے۔ کلرک ہے۔تھوڑا غصور ہے، غصہ آتا ہے تو مارنے مرنے پر آجاتا ہے۔ان کی فرمائش ایک کار کی ہے کم از کم تین لاکھ کی تاکہ اپنے دوستوں کے یہاں گھوم سکیں، کار سے۔

اکبر صاحب نے کہا" چھوڑو چھوڑو مجھے گھمکر لڑکا نہیں چاہئے۔

دوکاندار نے کہا اب صرف دو طرح کا مال رہ گیا ہے۔ پہلا جس نے بی.اے. پاس کرلیا ہے مگر نوکری نہیں ہے۔ جو شخص اسے اچھی نوکری دلوا دیگا۔لڑکا اس کی بیٹی سے شادی کریگا۔

اکبر صاحب نے کہا اپنی نوکری کے تو لالے پڑ رہے ہیں۔ بھلا دوسروں کو میں نوکری کہاں سے دلا سکتا ہوں۔

دوکاندار نے کہا کوئی بات نہیں صاحب، کسی بڑے آدمی کی نظر پڑ گئی خوبصورت اور اسمارٹ لڑکے کو وہ اونچے عہدے پر پہنچا دینگے۔

ہاں ہاں ایک لڑکا یعنی مال رہ گیا ہے۔ یہ آفس میں چپراسی ہے۔ غریب ہے لیکن بہت ہی شریف ہے۔ بیوی کو ہر کام میں مدد کریگا۔ جھاڑو دینا، کپڑے دھونا، کھانا بنانے میں، سب کاموں میں بیوی کی مدد کریگا۔ آپ کو معلوم ہی ہے ان دنوں نوکر دائی کا کتنا بڑا مرحلہ ہے۔ اگر شوہر نوکر بن کر مدد کرتا ہے تو اس سے بڑھ کر خوشی کی اور کیا بات ہوسکتی ہے۔ اس لڑکے کو نقد روپیہ تو نہیں چاہئے لیکن ہر ماہ اسے چار پانچ ہزار روپئے کی مدد چاہئے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو لڑکی کم از کم بی۔اے۔ پاس ہو اور ہر ماہ چار پانچ ہزار کی مدد شوہر کو کرے تاکہ زندگی اچھے سے گذرے۔

اکبر صاحب نے کہا چھوڑو چھوڑو مجھے بیوی کی کمائی کھانے والا داماد نہیں چاہئے۔ نمک روٹی ہی کما کر کھائے کھلائے ویسا لڑکا چاہئے۔

دوکاندار نے کہا بس اب آخری مال رہ گیا ہے۔ یہ لڑکا اسے ایک عدد اسکوٹر چاہئے اس کی ماں کی فرمائش ہے کہ اس ماں کی فرمائش ہے کہ کم از کم اس کی بہو کو بیس جوڑے اچھے کپڑے چار تولہ سونا اور دس تولہ چاندی ملے۔ بس اور سو باراتی کو اچھا کھانا وغیرہ وغیرہ۔

اکبر صاحب وہاں سے جانے لگے تو دوسرے دوکاندار نے ان کو روک لیا۔ وہ بہت دیر سے اکبر صاحب کو پریشان دیکھ رہا تھا۔ اس نے اکبر صاحب کو اپنی طرف بلا کر کہا آیئے صاحب میں آپ کے لائق مال دکھاتا ہوں۔ مال سستہ آپ کے لائق۔ یہ پہلا دیکھئے۔ ایک ادھیر عمر کے آدمی کو دکھاتے ہوئے بولا دیکھئے صاحب عمر پچاس سے پچپن کے بیچ ہے ان کی ایک عدد بیوی اور دو تین بچے بھی ہیں۔ لیکن ان کو شادی کا شوق ہوگیا ہے۔ اچھے پیسے والے ہیں۔ کوئی تکلیف نہ ہوگی آپ کی بیٹی کو لیکن

ان کی ایک شرط ہے وہ یہ کہ لڑکی کی عمر اٹھارہ سال سے زیادہ نہ ہو۔ اکبر صاحب نے جواب دیا میری بیٹی کی عمر اٹھائیس سال ہوگئی ہے۔ اس لئے یہ بھی نہیں چلے گا۔ ساتھ ایک شادی شدہ سے میں اپنی بیٹی کی شادی کبھی نہیں کرونگا۔

دوکاندار نے پھر دو بوڑھوں کو دکھایا۔ دیکھئے صاحب ایک بزرگ انسان ہیں دیتا ہوں آپ کو سکندر ہنر والے کی پہلی بیوی چھ عدد بچے چھوڑ کر خدا کے یہاں سدھار گئی ہے وہ اچھے پیسے والے ہیں۔ آپ کی بیٹی کو چھ عدد بچوں کی دیکھ بھال کرنی ہوگی کسی چیز کی پریشانی نہیں ہوگی۔ عمر پچپن سے ساٹھ کے درمیان ہے۔ بال رنگ لیتے ہیں اور دانت نقلی لگا لیتے ہیں۔ تو عمر سے بیس سال کم لگنے لگتے ہیں ان کی کوئی ڈیمانڈ نہیں ہے بلکہ آپ کے گھر بھر کی پرورش کر سکتے ہیں۔ انہیں دولہا بننے اور باجے گاجے کا بڑا شوق ہے۔ بس آپ اس کے لئے سہرے مکنے، گھوڑے جوڑے، باجے گاجے کا انتظام کر دیں۔ بارات آپ کے دروازے پہنچ جائے گی۔

اکبر صاحب اس کی بکواس سے پریشان تھے اور واپس جانے والے تھے کہ دوکاندار ان کا ہاتھ پکڑ لیا بس ایک اور دیکھ لیں۔ شاید پسند ہو جائے۔ دیکھئے دیکھئے۔ یہ صاحب ہیں عمر ساٹھ سے ستر کے درمیان ہے۔ اس نے ایک بوڑھے کی طرف اِشارہ کیا۔ ایک بوڑھا آدمی جس کے بال اُڑے تھے۔ گال چپکے تھے جسم سے ٹیڑھا لگ رہا تھا کو دکھاتے ہوئے بولا۔

دیکھئے دیکھئے صاحب ان کے بڑھاپے پر مت جائیں بڑے لکھپتی ہیں۔ یہ اُلٹا لڑکی والے کو ایک مکان اور ایک کار بھی ہمیشہ کے لئے استعمال کرنے کو دے دینگے۔

اکبر صاحب کو لالچ سی آئی۔ زندگی بھر سائکل کی سواری کی ہے۔ کار مل جائیگی۔ تو مزآ جائے گا زندگی بھر بسوں اور ٹیمپو پر بیوی بچے بیٹھے۔ مفت کی گاڑی مل

جائے تو زندگی کا یہ خواب پورا ہو جائے گا۔ برسوں سے کرائے کے گھر میں رہ رہا ہوں ۔ ہر وقت کرائے کا ہنگامہ اور مکان مالک کے آگے جھک کر رہنا۔ اپنا مکان ہوگا تو کیا مزا ہوگا۔ زندگی میں تو یہ اپنے مکان کی امید اور نہ گاڑی کی۔ یہی ٹھیک رہے گا۔ اکبر صاحب نے دوکاندار سے حامی بھرلی اور بڑے میاں کا ہاتھ پکڑ کر لے چلے۔ گھر کی طرف کہ اچانک ان کی آنکھ کھل گئی اور وہ چلّانے لگے۔ نہیں نہیں نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔ بیوی اور بیٹی ان کے پاس آکر پوچھنے لگیں طبعیت تو ٹھیک ہے۔ پانی پی لو کیا ہوا۔ سب لوگ پریشان ہوگئے۔

اکبر صاحب نے اپنا پورا خواب بیوی کو سنا دیا۔ کتنا خطرناک خواب تھا اللہ بچائے ایسے خواب سے ویسے حالات دنیا کے خواب جیسے ہی تو ہیں۔

ابھاگن

گیت کی جھنکار سے پورا گھر گونج رہا تھا۔ خواتین ڈھولک کی آواز کے ساتھ سر ہلا رہی تھیں۔ گیت کے درمیان سر اُٹھا کر باہر کی طرف بھی دیکھ لیتی کہ دُلہن کی گاڑی تو نہیں آرہی ہے۔ صبح سے عورتوں کو دُلہن کا انتظار تھا۔ اس لئے وہ اپنے کاموں کا نپٹارہ کر جلد سے جلد یہاں آ گئی تھیں۔ کچھ لوگ تو باہر سے آئے ہوئے تھے۔ مدھو بابو کے چھوٹے بیٹے کی شادی تھی۔ دو ہی تو بیٹے تھے ایک تو بھگوان کے یہاں چلا گیا اور یہ دوسرا اور سب سے چھوٹا بیٹا جس کی شادی کی تمنا سب کو تھی۔

بڑے بیٹے سدھیر کی بہو بھی چھوٹی دیورانی کے انتظار میں بے چین تھی۔ گو اس کی اہمیت گھر میں نا کے برابر تھی لیکن رسوئی تو اس کے ذمہ تھی اور وہ دن رات رسوئی کے کام میں لگی رہتی اور اپنے غم کو بھلا کر زندگی کی گاڑی کھینچ رہی تھی۔

گھر میں اس سے ہمدردی رکھنے والوں میں سسر جی مدھو بابو اور دیور رندھیر

تھا جسے پیار سے لوگ رانو کہا کرتے۔ ارچنا گھر کی بڑی بہو تھی بہت سی ذمہ داریاں اس کے ذمہ میں تھیں۔ نندیں مہمان بن کر آئی تھیں اور مہمان کی طرح رہتی بھی تھیں۔ ارچنا سب لوگوں کی خدمت میں لگی رہتی اس کے باوجود اس کی باتوں میں غلطیاں نکالی جاتیں۔ خاص طور پر ساس اور نند ہی تو اس کو بالکل پسند نہیں کرتی تھیں۔ اتنے لوگوں کے کھانے پینے کا انتظام اور پھر اس پر فرمائش بھی وہ تو صبح سے رات تک چوکے سے نکل نہیں پاتی۔ الجھے الجھے بال اور معمولی کپڑوں میں وہ ایک دائی کی مدد سے سارے کام نپٹاتی رہتی۔

عورتیں رنگ برنگے کپڑے پہنے اور طرح طرح کے زیور سے آراستہ ہو کر اس کے سامنے سے گذرتیں تو ارچنا کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ایک بکس کپڑے اس کے بھی رکھے ہیں۔ جسے اس کو پہننے کا موقع نہ ملا۔ اور نہ وہ کپڑے دوسری عورتیں پہننا چاہتی ہیں کیونکہ یہ کپڑے ایک بیوہ عورت کے ہیں۔ اسے بجی سجائی عورتوں کے پاس جانے میں بھی ٹھیک نہیں لگتا۔

ارچنا کو خیال آیا۔ ایک زمانہ ارچنا کا بھی تھا جب وہ لال جوڑے میں زیور سے لدی لدائی رخصت ہو کر سسرال آرہی تھی۔ اس کی نظر بار بار سدھیر کی طرف جاتی۔ دونوں ایک دوسریکو دیکھتے مسکراتے اور آنے والے مستقبل کے لئے سیکڑوں ارمان بٹور رہے تھے۔ ایک خوشگوار زندگی کا خواب لئے ارچنا سسرال آگئی۔ مدھوکر اسے بہت پیار کرتا تھا اور ارچنا کے کاموں اور اس کے خلوص کی تعریفیں بھی کرتا تھا جو اس کی ماں اور بہنوں کو بالکل پسند نہیں آتا۔ کتنا اچھا تھا اس کو شوہر کبھی کسی کی بات کا شکایت اسے نہیں ہوئی اور اس طرح زندگی خوشگوار گذرتی رہی۔ اسی طرح ایک سال گذر گئے۔

کام سے فرصت پا کر ارچنا اپنے کمرے میں آ گئی اور اپنے بکس سے ایک گلابی خوبصورت ساری نکالا اور کچھ زیور جسے پہن کر وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ چہرا اترا ہوا آنکھیں دھنسی ہوئی اور لب سوکھے ہوئے اس نے کاجل اور ہونٹون میں لالی لگائی اب وہ اور بھی اچھی لگنے لگی اس کا دل چاہا کہ اسی حالت میں وہ دیورانی کو اُتارے پر رشتہ دار کی ایک بچی نے اسے دیکھ لیا اور پھر کچھ ایسا تماشہ ہوا جیسے اس نے کوئی پاپ کر دیا ہو۔ بہت ساری عورتیں اس کے کمرے میں آ کر طرح طرح کی باتیں کرنے لگیں۔ ارچنا ایک تماشہ بن گئی۔

سدھیر کو یہ ساری بہت پسند تھی جس دن ٹور میں جانے لگتا ارچنا سے یہی ساڑی پہنے کو فرمائش کرتا وہ اس ساڑی کو پہن کر اور بن سنور کر اس کے سامنے جاتی تو وہ بہت خوش ہو جاتا تھا۔ ارچنا نے اس کی آتما کی خوشی کے لئے یہ ساڑی پہن لیا تھا آج۔

عورتوں کو دیکھ کر ارچنا فوراً باتھ روم میں چلی گئی اور فوراً کپڑے بدل لئے لیکن عورتوں کی کہاسنی ہوتی رہی۔ طرح طرح کی باتیں اس کے کانوں میں آتی رہیں اور وہ روتی رہی۔ ویسے بھی اس طرح کی باتوں کو سننے کی وہ عادی ہو گئی تھی۔

سدھیر ایک پولس انسپکٹر تھا۔ محنتی نوجوان تھا۔ ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے اسے کئی انعام بھی ملے تھے لیکن اس کو اپنی جوانمردی اور وفاداری کا ثبوت اپنی جان دیکر چکانا پڑا تھا۔ سدھیر کی لاش جب گھر آئی تو اتنا خراب ماحول تھا اس وقت سب سدھیر کی بہادری کے راگ الاپنےلگے۔ سرکار کی طرف سے خوب خوب تعریفیں اور میڈل ملا جو ارچنا نے رو رو کر حاصل کئے۔ پیسے بھی اسے ملتے رہے لیکن پیسے اور میڈل اس کے غم کو دور نہیں کر سکے۔ ایک سال صرف ایک سال سدھیر کے ساتھ

گذارے وہ دن تو واپس نہیں آئے۔ اس کا سہاگ لُٹ گیا۔ وہ تو واپس نہیں ملا۔ مائکے اور سسرال کے لوگ آنسو پوچھنے ضرور آئے لیکن دل کا داغ تمغہ دل اور تحفہ مٹا نہیں سکا اور بہادری کے سارٹیفکٹ پڑے پڑے ارچنا کا منہ چڑھاتے رہے اور وقت گذرتا گیا۔ رشتہ دار دھیرے دھیرے سب لوٹ گئے رہ گئیں ارچنا اپنے بھیگی آنکھوں کے ساتھ۔ ابھاگن اور منحوس ہونے کا کلنک لگ گیا اس کے ماتھے پر۔ جسے وہ آج تک مٹا نہیں سکی۔ ساس کہتی آتے ہی جوان بیٹے کو کھا گئی۔ نند بھی کہتی، کون سی منحوس گھڑی میں شادی ہوئی تھی۔ بھگوان کرے رانو بھیا پر اس عورت کا سایہ بھی نہ پڑے۔

اسی طرح سوچتے سوچتے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی، تب ہنگامہ ہوا دُلہن آئی، دُلہن آگئی۔ ارچنا اپنے آنسو پوچھ کر باہر نکلی۔ عورتیں بول رہی تھیں "اس شبھ گھڑی میں رونا دھونا کتنا منحوس لگتا ہے۔ اس پرنئی دُلہن پر بیوہ کا سایہ بھگوان بچائے۔

ارچنا کی نندوں نے آرتی اُتاری، ساس نئی بہو کو گھر کے اندر لائیں۔ پوجا کا انتظام تھا ہی۔ ارچنا بھی نئی دُلہن کو دیکھنا چاہتی تھی لیکن اس کی پہنچ وہاں تک نہیں ہوئی۔ سبھی عورتوں نے اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کیا۔ انو جس کو ارچنا اپنے چھوٹے بھائی کی طرح پیار کرتی تھی اور اکثر اس کی طرفداری میں دوسروں سے بگڑ جاتی تھی اور اس کے شوق کے پکوان بناتی تھی۔ دُلہن کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ بہت خوش تھا آگے بڑھا اور سب عورتوں کو الگ کرتے ہوئے ارچنا کے پاس آیا اور ہاتھ پکڑ کر اپنی نئی نویلی دُلہن کے پاس لے گیا۔ ارچنا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ نئی دُلہن نے اپنے نئے جوڑے سے جٹھانی کے آنسو پوچھ دئے۔ عورتیں جو ناراض تھیں طرح طرح کی باتیں کرتی رہیں لیکن رانو نے ایک نہ سنی۔ اس نے اپنی نئی نویلی دُلہن کے بغل میں ارچنا کو بیٹھا کر پوری پوجا کیا اور کہبر پوجا کے وقت بھی بھابھی کو آگے کر لے گیا۔ رانو کی

ڈلہن نے ساس نندوں رشتہ داروں کے ساتھ جٹھانی کے پیر چھو کر آشرواد لئے۔ رانو نے ارچنا کا ہمیشہ ساتھ دیا تھا لیکن ارچنا کو ڈر لگتا تھا کہ شادی کے بعد واحد رانو بھی کہیں مجھ سے منہ نہ موڑ لے لیکن ہوا اس کے برعکس۔ رانو بھابی کا ہمیشہ طرفداری کرتا۔ ماں اور بہنوں سے جھگڑ جاتا تھا اور آج بھی اس نے اس کا ثبوت دیا۔ ارچنا کے چہرے پر رونق آ گئی۔ اس نے دیورانی کو خوب خوب پیار کیا اور لپٹا لیا۔ رانو کی شادی کو برسوں گذر گئے ہیں اس کے دو تین بچے بھی ہو گئے جو ارچنا کو بڑی ماں کہتے ہیں۔ رانو کی ڈلہن انشو ارچنا کی بہت عزت کرتی ہے اور اس کے بغیر اپنے سے کوئی کام نہیں کرتی ہے۔ انشو کے سامنے ارچنا کو برا بھلا کہنے کی کسی کو ہمت نہیں ہوتی۔ رانو جیسا تھا ویسا ہی رہا ایک اچھی اور کھلے دماغ کی عورت انشو نے گھر کا ماحول ہی بدل دیا۔ ارچنا کو رانو کی شادی کی باتیں اور عورتوں کے وہ طرح طرح کی باتیں یاد آئیں اور گذرے ہوئے وہ دن جب تک رانو کی شادی نہیں ہوئی اور لوگوں نے اس کے دل کو کس طرح چوٹ پہنچائی۔ اب کسی کی ہمت نہیں ہوتی کہ کوئی اسے ابھاگن اور منحوس کہہ سکے۔ رشتہ دار اور ارچنا کی نندیں بھی ناراض تو ضرور رہتیں، لیکن ابھاگن کا لفظ اس گھر میں پھر سے سنائی نہیں دیا۔ رانو کی باتیں اور ناراضگی کی وجہ کر ماں بھی خاموش رہنے لگیں۔ دوسرے لوگ اور محلے کی جاہل عورتیں بھلے ہی ابھاگن کا لفظ ضرور استعمال کرتیں لیکن گھر والے لوگ اسے ان سنی کر دیتے۔ آج بھی ارچنا ابھاگن کا لفظ سنتی ہے تو اس کے آنکھوں میں آنسو بھر جاتے ہیں۔ رانو کے بچوں کو وہ کلیجے سے لگا کر رکھتی۔ گھر کے لوگ انو اور اس کے بچے ارچنا کے بہت نزدیک ہیں نندیں آتی ہیں اور منہ بنا کر ناراض ہو کر چلی جاتی ہیں۔ ایک ابھاگن کی عزت گھر میں ہے وہ ان سے برداشت نہیں ہوتا۔

سکھ کی نیند

آج مجرموں کے سزا کا دن ختم ہو گیا۔ برسوں سے پریشان حال قیدی باہر نکلنے کو بے قرار ہو رہے ہیں۔ جس جگہ سناٹگی رہتی تھی۔ آج خوشی کا ماحول ہے۔ سب لوگ صبح کے انتظار میں ہیں لیکن وقت ہے کہ گذرنے کا نام ہی نہیں لے رہا ہے۔ پریشان حال قیدی ادھر سے اودھر گھوم رہے ہیں۔ کوئی کسی سے مل رہا ہے تو کوئی کپڑے کو ٹھیک کر رہا ہے لیکن ایک شخص غمگین اور پریشان حال تھا آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس شخص کا نام رام لال تھا۔ رام لال دنیا والوں کو اپنا منہ دیکھانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ زندہ ہی نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اس نے جیل سے باہر جانے میں کوئی خوشی ظاہر نہیں کی تو دوسرے قیدیوں کو بہت تعجب ہوا۔ رام لال کو اپنی زندگی سے نفرت سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دنیا والوں کو اپنا منہ دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ کھلی ہوا میں سانس لینے کی خواہش اس کی تھی لیکن پانچ پانچ جوان لڑکیوں کو دیکھ کر اس کا دل کبھبا کریگا۔ وہ ان لوگوں کو مدد کر سکے گا۔ کیا ان لوگوں کی شادی بیاہ کر سکے گا؟ اب تو بدنامی ہوگی اس کی۔ کون اس سے رشتہ جوڑنا چاہے گا۔ لڑکیاں بیچاری تو بے قصور ہیں لیکن قصور صرف یہ ہے کہ ایک غریب باپ کی بیٹیاں ہیں جو مفلسی میں زندگی گذرانے کی عادی ہوگئی ہیں۔ معمولی کھانا اور پھٹے پرانے کپڑے پہن کر بھی ان لڑکیوں نے اپنی عزت کو بچا کر رکھا۔ رام لال کو چھ ماہ کی قید کے بعد کسی سے ہمدردی اور مدد کی اور بھی کوئی امید نہیں نظر آتی تھی۔ رام لال کو پرانی باتیں یاد آنے لگیں۔ تیس اکتیس سال قبل اس کی شادی ہوئی تھی۔ لال ساری میں پیاری سی دُلہن اس کے گھر آ گئی۔ رام لال اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ماں باپ نے بہت شوق سے اس کی شادی کی تھی۔ کچھ زمین بھی رام لال کے باپ نے فروخت کر دیا تھا۔

چھ سالوں تک رام لال کے یہاں کوئی اولاد نہ ہوئی تو اس کی ماں بہت فکر مند ہوگئی۔ دوا علاج ٹونے ٹوٹکے ہوئے تو رام لال کی بیوی سے ایک پیاری سی بچی کو جنم دیا۔ بڑی خوشی منائی گئی لیکن خوشی بہت دنوں تک قائم نہیں رہی کیونکہ ہر دو سال پر رام لال کے یہاں ایک بچی پیدا ہوتی رہی اور دس سالوں میں اس کی تعداد پانچ ہو گئی۔ رام لال کی ماں کو پوتے کا شوق اور رام لال کو ایک بیٹے کی امید نے پانچ عدد بیٹیوں کا باپ بنا دیا۔ لڑکیاں پیدا تو آگے پیچھے ہوئی تھیں لیکن سب برابر سی لگنے لگیں۔ لڑکیوں کی پیدائش کا سلسلہ تو ختم ہوا لیکن رام لال پر ذمہ داریوں کا بوجھ آ گیا۔ کم آمدنی خرچ زیادہ۔ رام لال اور اس کی بیوی دونوں لڑکیوں کو پیار تو بہت کرتے تھے لیکن ان کی فکر ان کو کھائے جاتی تھی۔ ایک کی شادی بھی وہ اگر کر پاتا تو کچھ تو اس کا بوجھ کم ہوتا لیکن ایسا نہ ہو پایا۔ بہت کوشش کے باوجود بھی وہ ایک بھی لڑکی کی شادی بھی نہ ہو سکی۔ گھر کے اخراجات کے بعد پیسے بچے بھی کہاں جو شادی کے لئے سوچ سکتا تھا۔ منشی کی نوکری گنے چنے پیسے اور نو لوگوں کا خرچ لڑکیاں خاموشی سے گھر کے کاموں میں لگی رہتی تھیں۔ رام لال انہیں دیکھ کڑھتا رہتا۔ وقت گذر گیا۔ بڑی کی عمر اٹھائس سال ہوگئی۔ بڑی مشکل سے رام لال نے دو لڑکیوں کو میٹرک پاس کرایا۔ بڑی لڑکی تو پاس کے اسکول میں پڑھا کر کچھ پیسے کما لیتی لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ رام لال بھی وقت سے زیادہ کام کر کے کچھ پیسے کما لیتا لیکن ماں باپ کی بیماری میں خرچ ہو جاتے۔

جب کوئی رام لال سے اس کی لڑکیوں کے بارے میں پوچھتا تو اسے ایسا لگتا جیسے کوئی اس کا اور اس کی غربت کا مذاق اُڑا رہا ہو۔ رام لال بہت ایماندار انسان تھا لاکھوں روپیوں کا لین دین سیٹھ کے یہاں کرتا لیکن ایک پیسہ بھی وہ اِدھر اُدھر نہیں کرتا۔

ایک دن سیٹھ نے رام لال کو بیس لاکھ روپیوں کا ایک بنڈل رکھنے کو دیا۔ رام لال کے ہاتھ تھرتھرانے لگے اور اس کی نیت بدل گئی۔ اتنے روپیوں سے تو اس کی سب لڑکیوں کی شادیاں ہو سکتی تھیں جو صرف روپیوں کی وجہ سے اب تک نہیں ہو پائی ہیں۔ اس نے سوچا ایسا سنہرا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے گا۔ روپئے دیکھ کر رام لال نے چابھی اپنے پاس رکھ لی۔ سیٹھ نے کوئی سوال نہیں کیا۔ بیس سالوں سے کام کرنے والے ایماندار انسان پر سیٹھ کو پورا بھروسہ تھا۔ رام لال چابھی لے کر اپنی میز پر بیٹھ کر کام کرنے لگا۔ لیکن وہ بہت بے چین رہا۔ کچھ دیر بعد جب کچھ اندھیرا ہو گیا اور سیٹھ پوجا کرنے مندر چلا گیا تو رام لال نے چابھی سے لوکر کھولا اور روپیوں کا بنڈل اپنے جھولے میں رکھ لیا اور چابھی سیٹھ کی بیوی کو پکڑا کر گھر آ گیا۔ راستے میں سوچ رہا تھا میں نے تو ایک پاپ کیا ہے۔ سیٹھ تو سینکڑوں پاپ کرتا اور ہر سال تیرتھ کرنے چلا جاتا اور شودھی کرا کر آ جاتا ہے۔ لیکن رام لال شرمندگی بھی محسوس کر رہا تھا اور گھبراہٹ الگ لیکن گھر آ کر جب اس نے اپنی بیوی کو سب باتیں سنائی تو وہ سخت ناراض ہوئی اور خوب جلی کٹی سنایا۔ رام لال شرمندہ تو تھا ہی بیوی کی بات سن کر اور بھی کشمکس میں پڑ گیا۔ آخر اس نے بیوی اور بیٹیوں کے کہنے پر اس روپیوں کو سیٹھ کو لوٹا دینے کا فیصلہ کر لیا اور پھر اسے جھولے میں رکھ کر فوراً سیٹھ کے پاس آیا۔ ہاتھ جوڑ کر اس نے سیٹھ سے معافی مانگی اور پورا قصہ سنا دیا۔

رام لال رو رو کر کہہ رہا تھا ''میں بہت شرمندہ ہوں کس طاقت نے مجھے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا۔ مجھے معاف کر دیں، معاف کر دیں، سیٹھ جی۔ رام لال نے سیٹھ جی کا پیر پکڑ لیا لیکن سیٹھ نے ایک نہ سنی اور فوراً پولس کو فون کر دیا۔ پولس نے آ کر رام لال کو پکڑ لیا اور اسے چھ ماہ کی قید با مشقت ہو گئی۔

رام لال اپنے آپ پر ملامت کر رہا تھا۔ ہاتھ میں ہتھکڑی کے ساتھ جب

رام لال گاؤں سے گذر رہا تھا۔ گاؤں کے مرد اور عورت اس کا تماشہ دیکھ رہے تھے لوگوں کی طرح طرح کی باتیں اس کے کانوں میں آ رہی تھیں لیکن وہ سر جھکائے چلا جا رہا تھا۔ رام لال نے سوچا کہ اگر وہ مر جائیگا تو رحم کھا کر لوگ چندہ جمع کر کے بھی اس کی لڑکیوں کا بیاہ کر دینگے لیکن وہ تو ان کو دُلہن بنا ہوا نہیں دیکھ سکے گا۔ یہ تمنا تو وہ دل میں لے کر دنیا سے چلا جائے گا۔

چھ ماہ کے جیل کا عرصہ تو گذر گیا لیکن رام لال ایک رات بھی شاید پوری نیند سویا ہوگا اور نہ ٹھیک سے کھایا پیا ہوگا۔ اس کی غیر موجودگی میں بہت لوگوں نے اس کے گھر آنا جانا چھوڑ دیا۔ گھر کا چولہا جلتا رہے اور پیٹ کی آگ بجھتی رہے اس لئے اس کی بیوی نے کئی گھر میں نوکرانی کا کام کرنے لگی اور بڑی بیٹی کی آمدنی سے کسی طرح گذر بسر ہو رہی تھی۔ رام لال کو یہ سب خبر ملتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی بیوی کسی بیٹی کو لے کر اس سے ملنے آ جاتی تھی۔ رام لال ان لوگوں سے آنکھ ملا کر بات کرنے میں شرمندگی محسوس کرتا۔ کچھ دیر بعد وہ لوگ چلی جاتییں تو رام لال پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتا۔ دوسرے مجرموں کے بیچ میں رہ کر رام لال عجیب محسوس کرتا تھا۔ باہر نکلنے کے بعد لوگوں سے کسی طرح وہ نظر ملا سکے گا۔ اس کی عزت کرنے والے لوگ بھی اب اس سے دور ہو جائینگے۔

اب تو بچیوں کی شادی میں اور بھی مشکل ہو گی ایک مجرم کی بیٹی سے کوئی شادی کرنا چاہے گا کیا؟

سب قیدی جب خوشی خوشی باہر نکل رہے تھے رام لال کنارے کھڑا ہو گیا اور پھر باتھ روم جا کر اس نے خود کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس نے اپنے گمچھے کو گلے میں لگا کر پھانسی لگا لی۔ صبح جب جمعدار باتھ روم گیا تو اسے رام لال کی لاش ملی اس نے پیروں سے دھکہ دے کر باہر کر دیا اور گالیاں بکنے لگا۔ حرامی کو مرنا تھا تو گھر جا کر

مرتا۔ یہاں مر کر ہم سب کو مصیبت میں ڈال دیا۔ ایک خط بھی اس کے جیب سے نکلا جس میں اس نے لکھا تھا۔

میں اپنی زندگی کو ختم کر رہا ہوں اس کی ذمہ داری کسی کی نہیں ہے۔ میں اپنی خوشی سے موت کو گلے لگا رہا ہوں۔ میں اپنی ذمہداریوں کو پورا نہ کیا مر کر بھی مجھے چین نہیں ملے گا لیکن مرنے کے بعد سکھ کی نیند آئیگی کیا؟

رام لال

رام لال سکھ کی نیند سو رہا تھا سکھ کی نیند

خودکشی

میں جس فلیٹ میں رہتی ہوں اس کی اوپری منزل پر ایک کھوسٹ سی رٹائر عورت رہتی ہے جو کبھی سرکاری اسکول کی پرنسپل ہوا کرتی تھی۔ وہ گھر سے بہت ہی کم نکلتی تھی لیکن اگر وہ کسی کام سے باہر نکل بھی جاتی ہے تو بچے ڈر سے سہم سے جاتے ہیں ۔چھوٹے بچے تو گھر میں گھس جاتے ہیں۔ سب عورتیں بھی اس عورت سے گھبراتی ہیں مرد بھی اس کے سائے سے گھبراتے ہیں۔ اس عورت کا حلیہ کچھ اس طرح کا تھا۔ رنگ گہرا کالا چہرے پر جھری پیشانی پر شکن۔ پچکے ہوئے گال، بھوئیں تنی ہوئی۔ مجھے تو اس کی آج تک بات نہیں ہوتی لیکن اس کا باورچی اکثر ہم لوگوں کے یہاں آجاتا اس نے ہم لوگوں کو بتایا میں پچھلے چالس سالوں سے اس عورت کے یہاں کام کر رہا ہوں۔ شروع سے یہ دیکھنے میں اتنی خراب نہیں لگتی تھی لیکن جوانی میں ہی اس عورت نے ایک اچھے گھرانے کے تندرست اور اچھی شکل صورت کے لڑکے کو پٹالیا اور پھر شادی بھی ہوگئی لیکن ان لوگوں کے کوئی بچے نہیں ہوئے۔ دونوں کی جوڑی اس قدر خراب لگتی تھی لیکن وہ لڑکا بہت ہی شریف تھا اس عورت کے ساتھ اس نے زندگی

گذار دی بیس سالوں تک ۔ یہ دونوں ساتھ رہے کہ اچانک اس بیچارے کو کون سی بیماری نے پکڑا جس سے اُسے پیچھا چھرانا مشکل ہو گیا اور ایک دن وہ دنیا سے چلا گیا اس کے بعد سے یہ عورت بہت بدل گئی وہ چڑچڑی سی ہو گئی ۔ اس کے بعد سے اس عورت کی دلچسپی جانوروں سے بہت بڑھ گئی اور جانوروں سے عشق اور انسانوں سے اس کو نفرت شروع ہو گئی ۔ اولاد کی کمی کو اس نے جانوروں کے پیار میں بھلا دیا ۔ بوڑھا باورچی ساری عمر اس عورت کا ساتھ تھا اور اس کی ہر کمزوری سے واقف تھا ۔ ویسے وہ بھی ساری عمر کنوارہ رہ گیا ۔ اس عورت جس کا نام پاروبا جپائی تھا اس کے جانوروں کی خدمت میں اس شخص نے زندگی گذار دی ۔ ہم لوگوں کو اس شخص پر افسوس بھی لگتا ۔ بوڑھا آدمی سب کام کرنا ساتھ ساتھ جانوروں کی دیکھ بھال بھی ۔

پچھلے چھ سالوں سے یہ عورت اپنے دس عدد کتوں چار عدد بلی اور دو عدد بکری کے ساتھ اس فلیٹ میں رہ رہی ہے ۔ ایک کمرا جانوروں کے لئے ہے ۔ باورچی نے بتایا جب وہ سروس میں تھی اپنے ماتحت کو دل کھول کر ستاتی تھی اور دو نمبر کے پیسے بھی خوب کمائے ۔ اس کے قصے سن کر مجھے لگتا کیا عورت ایسی بھی ہو سکتی ہے ۔

میں نے اکثر کتے کے بچے کو گود میں لے جاتے آتے دیکھتی پر اس سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی اور نہ وہ ہم لوگوں کی طرف دھیان دیتی ۔ کبھی کبھی ہم لوگ نے درجن بھر کتے اور اس کے بچوں کو شام کے وقت اس عورت کو نوکر کے ساتھ گھومنے جاتے ہوئے دیکھا لیکن ہم لوگ خاموشی سے سب دیکھتے پر کسی کو نہ اس کی فکر ہوتی اور نہ وہ دوسروں کی طرف دھیان دیتی ۔

ایک روز ہم لوگوں نے کتے کے ایک بچے کو گود میں لے کر اس کو کار سے جاتے دیکھا ۔ شاید کتے کا بچہ بیمار تھا ۔ بوڑھی عورت جس کا نام نوکر کے مطابق پارو تھا ۔ ساری عمر وہ جانوروں سے محبت کرتی رہی اور انسانوں سے نفرت ۔ محلے بلکہ ۲۱

فلیٹ میں لوگ رہتے تھے غم اور خوشی سب ہوتی لیکن اس عورت کو کسی سے کوئی مطلب نہیں رہتا۔ سب سے انجان بنی جانوروں کے ساتھ اپنی زندگی گذار رہی تھی۔ چھوٹے بچے اگر اس کے سامنے آجاتے تو اس کی بھویں چڑھ جاتیں مگر کتے بلّی اور بکری کے بچوں کو پھدکتے دیکھتی تو اس کی آنکھوں میں چمک آجاتی اور خوش ہو جاتی۔ کتے بکری اور بلی کے چھوٹے بچے اس عورت کے کمرے میں سوتے دوسرے کمرے میں باقی جانور رہتے۔ نوکر گھر سے باہر نوکروں کے کمرے میں ہوتا۔ نوکر راگھوگوپ یہ کہتا کہ پارو رات بھر اُٹھ کر جانوروں کی دیکھ بھال کرتی اور کتے کے بچون کے پھلئے بھی بدلتی رہتی ہے۔

پاگل ہے پاگل میں دل ہی دل میں سوچتی۔ وقت تیزی سے گذرنے لگی۔ میری مصروفیت بھی کچھ زیادہ ہوگئی کہ اس عورت کے بارے میں مجھے سوچنے کا موقع نہیں ملا اور اس کے بارے میں سن سن کر بور ہو چکی تھی۔ اس لئے اس طرف دھیان دینا ہی بند کر دیا تھا۔ اچانک ایک رات پارو (بوڑھی عورت) کے فلیٹ میں رونے چلاّنے کی آواز آنے لگی۔ ہم لوگ گھبرا کر اس عورت کے فلیٹ کی طرف دوڑ پڑے۔ بوڑھی عورت زور زور سے چلا چلا کر رو رہی تھی۔ راستے میں ہم لوگوں کا ارادہ بدل گیا لیکن جوں ہی ہم لوگ واپس آنے لگے اس عورت کا باورچی ہم لوگوں کے سامنے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔

"میم صاحب دیوانی ہو رہی ہیں ان کی پیاری بکری مر گئی۔ ڈاکٹر کو فون بھی نہیں ہو سکا اور اچانک مر گئی۔ میم صاحب کی اپنی کوئی اولاد تو ہے نہیں یہی جانور تو ان کے بال بچے ہیں۔ وہ تو رو رو کر اپنا برا حال کر لینگی۔ مہربانی کر کے آپ لوگ ان کو سمجھایئے۔

باورچی کے کہنے پر ہم لوگ کمرے میں داخل ہو گئے سب سے پہلے کمرے

میں جانوروں کھانے کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ دوسرے کمرے میں جانوروں کا بیڈ روم۔ ہم لوگ دیکھ کر تعجب میں پڑ گئے۔ خوبصورت مسہریاں اس پر مچھر دانی لگی ہوئی۔ جس پر کتے بلی اور بکری کے سونے کا انتظام تھا۔ تیسرے کمرے میں بارودیوی بوڑھی عورت بکری کی لاش سے چپکی ہوئی روتی جارہی تھی۔

ہم لوگوں کی زندگی کا یہ پہلا اتفاق تھا کہ جانور کی موت پر کوئی اس طرح غم منا رہا ہو۔ جانور کی موت پر حاضری دینے کا بھی ہم لوگوں کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ کیا بولا جائے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ دو چار الفاظ ہمدردی کا بول کر ہم لوگ واپس آگئے۔ ہم لوگوں کی باتوں پر اس عورت نے کوئی دھیان نہیں دیا۔

''پاگل ہے پاگل'' ہم لوگوں کے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔ کئی دنوں کے بعد باورچی ہم لوگوں کے یہاں اور ایک نئی خبر سنا گیا کہ ہماری میم صاحب نے ایک نوکر کو یہ کہہ کر نکال دیا کہ اس نے ہماری پیاری بکری کو زہر دے دیا۔ اور اس نوکر پر پولس کیس کر دیا ہے۔ بکری کا پوسٹ مارٹم بھی کیا گیا پر کچھ نہ نکلا۔ صرف نوکر کو ہٹا دیا گیا۔ ہم لوگوں نے دیکھا میم صاحبہ امبولینس پر بوکس میں بکری کے لاش لے کر چلی گئیں۔ مگر پاروا پادھیا نے نوکر کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔

نوکر نے ہم لوگوں کو بتایا کہ بکری نے علاج کا موقع ہی نہیں دیا ورنہ وہ تو علاج میں کوئی کسر نہ چھوڑتیں۔ ایک بار میم صاحب کا کتا بیمار پڑا تو میم صاحب نے کلکتہ سے ڈاکٹر بلا کر اس کا علاج کرایا۔ پر کتا بچ نہ سکا۔ جس کا میم صاحب کو مہینوں اثر رہا۔ گو میم صاحب نے اپنے پسند سے شادی کی تھی لیکن جانوروں سے اس قدر عشق کی وجہ کر ان کے اور شوہر کے رشتے کمزور ہوتے چلے گئے اور پھر دونوں الگ ہو گئے اور پھر ان کے شوہر بھی اللہ کے پیارے ہو گئے۔ جس کا میم صاحب کو خاص اثر نہیں ہوا۔ خیر زیر غور پریشانی تو بکری کی تھی کیونکہ پولس کیس ہو گیا تھا۔ پولس والوں کو

بھی ایک مزیدار کیس مل گیا تھا۔ کمبختی تو ہم لوگوں کی تھی کہ ہم لوگ تعزیت میں چلے گئے۔ پولس والے ہم لوگوں سے بھی پوچھ پاچھ کرنے آ گئے۔ ہزاران لوگوں کو ٹالنے کی کوشش کی مگر پولس والوں سے پیچھا چھڑانا آسان نہیں تھا۔ اس کے سوالوں کے بوچھار سے ہم لوگ پریشان ہو گئے۔ آپ لوگوں نے بکری کو کیسا دیکھا۔ کیا واقعی زہر دیا گیا تھا۔ کیا اس کے منہ سے نکلا جھاگ نیلا تھا؟ وغیرہ وغیرہ۔ فلیٹ کے مختلف لوگوں کے الگ الگ خیال تھے کسی نے کہا زہر دیا گیا ہے۔ کسی نے کہا زہریلی چیز کھا گئی ہوگی۔ کسی نے ٹوکا لگا یا خود مر گئی ہوگی وغیرہ وغیرہ سب کے الگ الگ خیال تھے کسی نے تو اتنا کہا کہ بکری کا ہارٹ فیل ہو گیا ہوگا۔

ڈانٹ ڈپٹ کے بعد پولس والا ہم لوگوں کے پاس پھر نہیں آیا لیکن بوڑھی عورت کے فلیٹ میں اس کا آنا جانا برابر رہا کیونکہ نوکر نے بوڑھی عورت پر بدنام کرنے کا مقدمہ کر دیا تھا۔ نوکر نے کہا کہ بکری کے مرنے کے بعد نوکر کی پٹائی بھی کی گئی تھی۔ اس کے بدن پر نشان بھی چوٹ کے ملے تھے۔

فلیٹ کا ماحول عجیب سا ہو گیا کبھی وکیل کبھی پولس والے۔ سب کی فلیٹ میں آنے جانے کا سلسلہ ہو گیا۔

ایک دن باورچی ہم لوگوں کے فلیٹ میں ہنستے ہوئے داخل ہوا۔ ہم لوگوں نے سوچا کوئی خبر لے کر آیا ہو۔ اس نے ہستے ہوئے ہم لوگوں کو بتایا ''بکری نہ زہر سے مری اور نہ بیمار ہو کر مری۔ بلکہ اس نے تو خودکشی کر لی۔ اس نے زہریلی چیز کھا کر خودکشی کر لی۔''

آخر کیوں ہم لوگوں نے سوال کیا؟

باورچی نے کہا۔ ''ساری عمر میم صاحبہ نے بکری کو اپنے پاس رکھا۔ کہیں جانے نہ دیتی تھی جس سے بکری سخت پریشان رہتی تھی۔ بکری کا عشق کسی بکرے کے

ساتھ چل رہا تھا۔ جس سے اس کی ملاقات کچھ دنوں قبل ایک باغیچے میں ہوئی تھی لیکن میم صاحب تو اس کو ملنے کا موقع کبھی نہیں دیتی تھی اور اس کی وجہ کر اس بکری نے اپنی زندگی کی لیلا سماپت کر دیا۔ مقدمہ تو اس بوڑھی عورت پر ہونا چاہے۔ جس نے دو پیار کرنے والوں کا ملن نہ ہونے دیا۔''

ہم لوگ زور سے ہنس پڑے یہ بات درست ہے۔ خودکشی موت کی وجہ تھی۔

عرفاتی رشتہ

''کمبخت منحوس دانت کھسوڑ کر بھیک منگی کی طرح ہاتھ پھیلا کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ یہ مردود حلال خور نہیں ہے حرام خور ہے مردود۔''

مکھولا نانی صبح صبح چلانے لگین۔ ماموں جان نے پوچھا ''کیا بات ہے۔ مکھولا نانی آج صبح صبح کس کے نام کے قصیدے پڑھ رہی ہیں۔''

مکھولا نانی اور زور سے بھڑک گئیں'' کیا بتایا جائے صبح صبح سکھچھنیا آ کر بیٹھ جاتی ہے۔ دروازے کے سامنے صبح صبح اس کا منحوس منہ دیکھ کر دن بھر خراب گذرتا ہے۔ صبح صبح آتی ہے اور مجھ سے بیڑی مانگتی ہے۔ مکھولا نانی نے اپنے جیب سے بیڑی نکالی اور سلگا کر پینے لگیں۔ یہ آخری بیڑی تھی اس لئے ان کی ناراضگی کچھ زیادہ تھی۔

مکھولا نانی سے ہم لوگوں کا کوئی خون کا رشتہ نہیں تھا لیکن وہ ہمارے نانا جان کی عرفاتی بہن تھیں۔ ہمارے نانا اور نانی نے ان دونوں کے ساتھ حج کیا تھا اور اس طرح یہ دونوں جو جایاں تھیں نانا۔ اور نانی کی عرفاتی بہنیں ہو گئیں اور پھر ہمارے نانیہال سے ان دونوں بہنوں کا تعلق اس حد تک ہو گیا کہ اپنے خون کے رشتوں سے کم نہیں۔ حج سے واپسی کے بعد دونوں بہنیں ہمارے نانیہال میں رہنے لگیں۔ مکھولا نانی تو کم رہتی تھیں لیکن مکھولا نانی مستقل طور پر ہم لوگوں کے ساتھ رہتی۔ ہمارے نانا ابا

تو ان کو باجی کہتے تھے لیکن باقی لوگ چھوٹے بڑے سب دائی نوکر تک ان کو نانی کہتے تھے۔ مکھو اور سکھولا نانی دونوں جاپان بہنیں تھیں دونوں کی شکل صورت ہی نہیں بلکہ قسمت بھی ایک ہی جیسی ہوگئی تھی۔ دونوں بہنیں بیوہ تھیں۔ دونوں کے بچے نہیں تھے۔ دونوں کا مزاج بھی ایک ہی جیسا ہوگیا تھا۔ یعنی دونوں چڑچڑی ہوگئی تھیں۔ چھوٹے بچے تو مکھولا نانی سے اس حد تک ڈرتے تھے کہ انہیں بھوت کہتے تھے۔ مکھولا نانی کو دیکھ کر بچے کھانا کھا لیتے تھے۔ دودھ پی لیتے تھے۔

گھر میں مکھولا نانی کی بہت اہمیت تھی۔ برسات شروع ہوئی اور مکھولا نانی مالی کو نیم کے پتے اور چھال لانے کا حکم صادر کر دیتیں اور پھر ہم بچوں کی آفت آجاتی۔ وہ نیم کی چھال اور نیم کے پتوں کو پتھر کوئلے کے چولہے پر رات بھر ہلکی آگ میں رکھ کر اس کا رس نکال لیتیں اور پھر ہم سب بچوں کو صبح صبح ایک ایک چائے کی پیالی سے پلایا جاتا۔ اس کے بعد ایک ایک جلیبی یا تھوڑہ تھوڑہ سوجی کا حلوہ ملتا۔ اس چھال کے اس کا کڑواپن آج بھی منہ کا مزا کڑوا کر دیتا ہے۔ پوری برسات میں پندرہ بیس بار تو ضرور اس زہر کو پینا پڑتا۔ ہزار عذر کریں یا منصوبہ بنا بنائیں لیکن اس سے نجات نہیں ملتی تھی۔

مکھولا نانی سب سے زیادہ لکھمنیا سے چڑھتی تھیں جو ہمارے یہاں کی مستقل جمعدارن تھی۔ وہ صبح کے وقت اپنا برتن لیکر آجاتی اور سیڑھی کے پاس اپنی مخصوص جگہ پر آکر بیٹھ جاتی اور قریب قریب روزانہ مکھولا نانی سے ایک عدد بیڑی ضرور مانگتی تھی۔ مکھولا نانی لکھنا بوا سے ناراض چاہے جتنا بھی رہیں مانتی بھی بہت تھیں۔ اس کے لئے دوائیں اور ٹانک منگا دیتیں۔ سرف اور صابن کے لئے پیسے دیتیں اور ساتھ بگڑتی بھی جاتیں "کمبخت کتنی گندی رہتی ہے۔ نہاتی نہیں بدبو کرتی ہے۔" مکھولا نانی بیڑی کو دوا کے طور پر استعمال کرتیں تھیں کسی نے ان کو کہہ دیا تھا کہ

روزانہ ایک بیڑی پینے سے گیس کی بیماری دور ہو جاتی ہے۔ لہٰذا وہ صبح صبح پابندی سے بیڑی پیتی تھیں۔ اگر مکھولا نانا لچھمنیا کو بیڑی دے بھی دیتیں تو اس کے ساتھ دس بیس باتیں بھی ضرور وسنا دیتی تھیں۔ ایک عدد بیڑی کے لئے لچھمنیا سب برداشت کر لیتی تھی۔ بیڑی ملتے ہی لچھمنا سلگا کر کش لگانے لگتی تھی۔ ہم نے ہوش سنبھالتے ہی مکھولا نانی اور لچھمنیا کو دیکھا اور دونوں کی نوک جھوک بھی اور سب لوگوں کو لطف اُٹھاتے بھی دیکھا۔

لچھمنیا چار عدد پیخانے کی صفائی کرتی۔ بچوں کے کلوٹ اور گندی کو صاف کرتی۔ آنگن میں جھاڑو لگاتی اور پھر سارے دن اپنی مخصوص جگہ پر آ کر بیٹھ جاتی۔ اس کی جگہ مقرر تھی ایک انچ بھی آگے پیچھے نہ کرتی تو مکھولا نانی اس کی جگہ پر پہنچا دیتی تھی۔

لچھمنیا کی زندگی کی کہانی بھی کچھ عجیب تھی۔ اس کا نام اس کے والدین نے لکھمی رکھا تھا پر وہ بیچاری لچھمنیا ہو گئی تھی اور اسی نام سے چھوٹے بڑے سب پکارتے۔ وہ کبھی کبھی اپنی کہانی سناتی۔ اس نے بتایا کہ اس کی شادی کب ہوئی کس سے ہوئی اور کہاں ہوئی اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ جب اس کو ہوش عقل آئی تو اس کو بتایا گیا کہ وہ بیوہ ہے اور ساری زندگی وہ وِدھوا (بیوہ) رہ گئی۔ گندگی صاف کرتے کرتے اس کی زندگی کی ساری خوشیاں صاف ہو گئیں اور زندگی گندی ہو گئی۔

ایک بار کا قصہ اس نے سنایا کہ جب وہ نواب صاحب کے یہاں کام کرتی تھی۔ لڑکیوں کو مہندی توڑتے دیکھا تو اسے بھی مہندی لگانے کا شوق ہو گیا اور اس نے بھی مہندی کے کچھ پتے توڑ لئے۔ نواب صاحب کی بیگم صاحبہ کو خبر ہو گئی اور انہوں نے آ کر مہندی کے کانٹے والی ڈال سے اسے اس قدر مارا کہ ہاتھ سے خون نکل گیا اور وہ داغ اس کے ہاتھ میں ہمیشہ کے لئے رہ گیا۔ ہاتھ سے زیادہ اس کے دل ودماغ پر

ایسا داغ پڑا کہ آج بھی اس قصے کو سنا کر وہ رو پڑتی ہے۔ لکھمنیا نے بتایا کہ اس وقت اسے اونچی ذات اور نیچی ذات کا کوئی فرق بھی نہیں معلوم تھا۔

لکھمنیا اپنی ڈیوٹی پوری کرتے ہی اپنی جگہ پر بیٹھ جاتی اور کبھی کبھی تو اُسی جگہ پر سو بھی جاتی اور جب اس کو افطاری ملتی بہت خوش ہو جاتی اور آذان کے قبل ہی کھانا شروع کر دیتی اور مکھولا نانی اس کو کھاتے دیکھ کر بھڑک جاتیں اور چلانے لگتیں۔

''کمبخت بھوکی کہیں کی آذاں کا بھی انتظار نہیں کرتی ہے۔ مانا کہ روزے نہیں رکھتی لیکن رمضان کے مہینے میں عزت تو کر سکتی ہے۔ مکھولا نانی کے اس تقریر کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور وہ اپنی خالی پلیٹ لئے بیٹھی رہتی۔ یوں بھی دن بھر میں جو بچے کھانا چھوڑ دیتے لکھمنیا کو مل جاتا اور وہ اسے بھی کھا لیتی۔ مکھولا نانی کو اس کا ہر وقت کھانا بالکل پسند نہیں ہوتا اور وہ اسے بگڑتی رہتی۔

''کمبخت کا پیٹ ہے یا خندق۔ ہر وقت گائے بکری کی طرح جگالی کرتی رہتی ہے۔ اس پر اتنی دبلی کھاتی ہے بکری کی طرح اور ہو گئی ہے۔ لکڑی کی طرح''۔ لکھمنیا اپنے پیلے پیلے دانت نکال کر ہنس دیتی۔ اسے کچھ برا نہیں لگتا تھا۔

مکھولا نانی صبح سے اُٹھ کر پورے گھر میں گشت کرتی رہیں۔ بالکونی میں کرسی لے کر بیٹھ جاتیں اور نیچے سے آئی تلاوت کی آواز سن ہمیشہ تعریف کرتیں کہ ہندو کا ریڈیو ہے لیکن صبح صبح قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہے۔ مکان کے نیچے حصے میں ایک پان کی دوکان تھی۔ صبح صبح کچھ مولانا لوگ پان کی دکان میں آجاتے اور وہ اپنے ریڈیو میں پاکستان لگا دیتا جہاں سے تلاوت ہوتی رہتی۔ مکھولا نانی خوش ہو جاتیں۔ ان کی باتیں سن سن کر سب لوگ لطف اندوز ہوتے۔

آج کے دور میں جہاں سگوں میں اس قدر پیار نہیں رہتا۔ وہاں عرفاتی رشتہ اتنا مستقل اور مستحکم تھا کہ خون کے رشتوں کو بھی مات دے رہا تھا۔

کوئی تقریب ہونے والی ہوتی تو مکھولا نانی قبل سے ہی گیت گنگنانا شروع کر دیتیں۔

خاندان میں کسی کو ولادت ہونے والی ہوتی تو مکھولا نانی پھلیے پوتڑے کی سلائی شروع کر دیتیں۔ چھوٹے چھوٹے کپڑے اپنے ہاتھوں سے سلنے لگتیں۔ بچے بیمار پڑے تو مکھولا نانی کی بیچینی دیکھنے کے لائق ہوتی۔ بار بار آ کر بچے کو دیکھنا اور دعائیں پڑھ پڑھ کر پھوکنا۔ ان کی عادت ہوگئی تھی۔

یوں تو لاکھوں لوگ عرفات کے میدان میں حج میں ہوتے ہیں اور سب آپس میں بھائی بہن ہوتے ہیں لیکن حج کے بعد کون اس کو نبھا پاتا ہے۔ جو بچے مکھولا نانی کے سامنے پیدا ہوتے تھے وہ ادھیڑ ہو گئے اور کتنے بزرگ خاندان کے اللہ کے پیارے ہوگئے اور ایک دن مکھولا نانی بہت آسانی سے اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔

گوان کی عمر کو اسی (۸۰) سال کی ہوگئی تھی لیکن وہ مرنے سے قبل تک اپنے کام کو خود سے کرتی رہیں۔ اور بہت آسانی سے چلی گئیں سب کو روتا دھوتا چھوڑ کر۔ ایک ماہ کے اندر دونوں بہنیں مکھولا نانی اور مکھو نانی سب کو چھوڑ کر دوسری دنیا میں رخصت ہوگئیں۔ مرتے وقت تک ان کی آواز میں وہ کشک تھی زور تھا۔

یہ ہے عرفاتی رشتہ جو خون سے بڑھ کر ثابت ہوا۔

چھوٹا سا آنگن

شہر کے سب سے گنجان محلے کے چھوٹے سے مکان کے آنگن میں ٹین کی بنی کرسی پر بیٹھ کر مدھو معمولی سی پیالی میں چائے کی چسکی لے رہی ہے جیسے وہ کسی عالیشان کوٹھی میں ڈنلپ کی کرسی پر بیٹھ کر قیمتی پیالی میں چائے کی چسکیاں لے رہی ہو۔ مدھو اپنے آپ کو کسی بڑے آدمی کی بیوی سے کم نہیں سمجھ رہی تھی۔ مدھو کی شادی

کو آٹھ سال گذر گئے ان آٹھ سالوں کے بعد مدھو کو سچی خوشی ملی تھی۔ حالانکہ مدھو شادی کر کے ایک عالیشان کوٹھی میں آئی تھی۔ جہاں اسے ہر طرح کی شان و شوکت کی چیزیں ملی تھیں لیکن سکون نہیں۔ نوکر اور دائیوں کے بھیڑ میں وہ اپنے آپ کو بھولتی جا رہی تھی۔

جب مدھو کی شادی ہوئی تھی وہ صرف انیس سال کی تھی۔ بی. اے. پاس لڑکی تھی۔ اس کا شوہر ششی ایم. اے. کا طالب علم تھا۔ ایم. اے کرنے کے باوجود بھی اسے اچھی نوکری نہیں ملی، باپ کی سفارش کے باوجود بھی ایک کرانی بن کر رہ گیا۔ ششی کے دونوں بڑے بھائی ڈاکٹر اور انجینیر تھے۔ شادیاں بھی ان کی بڑے گھرانوں میں ہوئی تھی۔ مدھو کے سسر شہر کے مشہور وکیل تھے۔ جن کے سامنے اچھے اچھے وکیل بھی مات کھا جاتے تھے۔ لاکھوں کی آمدنی اور شان و شوکت شہر میں ان کا اونچا رتبہ تھا۔ انہوں نے اپنی پانچ عدد بیٹیوں کی شادیاں اونچے گھرانے میں بڑے بڑے عہدے والوں سے کی تھی اور بے تحاشہ پیسے خرچ کئے۔

مدھو کے سسر سدھاکر بابو کی خواہش تھی کہ ان کے بعد ان کا بڑا بیٹا مشہور وکیل بنے گا پر ایسا نہ ہوا ششی تو ایک معمولی کرانی بن کر رہا گیا۔ باپ ماں کو اس کا بہت اثر ہوا ان لوگوں کو تو یہ بتاتے ہوئے بھی خراب لگتا کہ ان کا ایک بیٹا معمولی کرانی ہے۔ گھر والوں کے شوق پر پانی پھیر دیا تھا۔ ششی نے بڑے اور منجھلے بیٹے نے ان کا شوق پورا کر دیا اور عزت بھی رکھ لی۔ اور دونوں اپنے اپنے پیشے میں مشہور ہوئے اور زبردست کامیابی حاصل کیا۔ ششی کے پتا جی بہت خوشی سے اپنے بڑے دونوں لڑکوں کا ذکر غرور کے ساتھ کرتے ششی اور اس کی بیوی مدھو یہ سب سن کر خاموش ہو جاتے۔ ماں باپ کے اس رویے سے ششی بہت خاموش رہنے لگا۔

حد تو اس وقت ہو گئی جب ششی کے منجھلے دیور کی شادی اونچے خاندان میں

اور اا کھ پتی گھرانے میں ہوئی۔ اتنا زبردست جہیز اور دھوم دھام دیکھ مدھو کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ ایک معمولی گھرانے کی لڑکی تھی۔ پورا خاندان بھی مڈل کلاس کا تھا۔ منجھلی بہو اتنے سامان لے کر آئی کہ دائی نوکر بھی اس کی خاطر مدارات میں لگ گئے۔ منجھلی بہو کے والد بھی بڑے عہدے پر تھے روزانہ اس کے گھر سے طرح طرح کے پکوان آتے اور لوگ تعریف کرتے نہیں تھکتے۔

مدھو گھر کے کام کاج میں لگی رہتی۔ اپنے گھر ساس سسر کی خدمت میں کوئی کمی نہیں رکھتی لیکن گھر میں اس کے ہر کام میں برائی نکالی جاتی پھر بھی مدھو خاموش تھی۔ منجھلی دیورانی کی عزت گھر میں بہت زیادہ تھی۔ ہر کام میں اس سے رائے مشورے پوچھے جاتے۔

دو سال تک تو مدھو یہ سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ اتنے دنوں میں وہ دو بچوں کی ماں بھی بن گئی اور منجھلی دیورانی کے یہاں بھی ایک بیٹا ہو گیا۔ جب کے مدھو کے یہاں دو بیٹیاں ہو گئیں۔ بیٹے کی پیدائش پر خوب دھوم ہوئی لیکن مدھو کی بیٹیوں پر فضول خرچ کرنا کسی کو گوارہ نہ تھا۔ بیٹا ہو جانے سے گھر کے سب فرد بہت خوش تھے۔ مدھو کی دونوں بیٹیاں بھی بہت پیاری تھیں لیکن بیٹی تو بیٹیاں ہی ہیں۔ ششی نے اپنی صلاحیت کے حساب سے دونوں بیٹیوں کا داخلہ محلے کے ایک معمولی اسکول میں کرا دیا ۔دونوں پڑھنے میں اچھی نہیں لیکن گھر میں ان کی اہمیت کچھ خاص نہیں تھی۔ ہزار لوگ نئے خیال کے ہوں اور بلند خیال کے ہوں لیکن یہ لڑکی اور لڑکے کا فرق شاید ہی کبھی دور ہو۔ اس فرق کو دیکھ کر مدھو کڑھتی رہتی۔ بچیوں پر بھی اس بے انصافی کا اثر ہو رہا تھا۔ جس کا نفسیاتی اثر دونوں بچیوں پڑ رہا تھا وہ دونوں خاموش اور ڈری ڈری سی رہتیں۔

حد تو اس وقت ہو گئی جب سدھاکر بابو نے سب سے چھوٹے بیٹے راجن کی

شادی بھی ایک بہت بڑے گھرانے میں کی۔ یوں تو مدھو ہر کام میں آگے آگے رہتی
لیکن دونون دیورانی کی عزت تھی۔ شادی میں اس کے مائکے سے اتنے پکوان اور اتنے
سامان آئے کہ لوگوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں لیکن مدھو کے گھر سے بہت معمولی
سامان آیا جس پر کسی نے دھیان بھی نہیں دیا۔

چھوٹی بہو کے آنے کے بعد کوٹھی کا ماحول بہت خراب ہو گیا تھا۔ دونوں
بہوئیں گھر میں بہت اہمیت رکھتی تھیں۔ مدھو بہت شرمندگی محسوس کرتی۔ بچیاں پیار کی
محتاج تھیں لڑکیوں پر نفساتی اثر ایسا ہونے لگا کہ وہ دور دور رہنے لگیں۔ نہ پڑھائی میں
اچھی رہیں نہ گھر میں۔

گھر میں دو دو گاڑیاں تھیں لیکن مدھو باہر جانے کیلئے رکشے کا استعمال
کرتی اور اس کا شوہر آفس سائکل سے جاتا۔ مدھو کی گھٹن اور بچوں کی یہ حالت
دیکھ دیکھ کر ششی بہت پریشان رہتا لیکن ششی کے دونوں چھوٹے بھائی عیش کی
زندگی گذار رہے تھے۔

مدھو سوچتی تھی کہ پیسوں میں کیا اہمیت ہوتی ہے جو ماں کی ممتا میں تبدیلی پیدا
کر دیتا، باپ کے پیار میں بھی فرق پیدا کر دیتا ہے۔ مدھو کے دیور کا بیٹا قیمتی کھلونے
سے کھیلتا جسے دیکھ کر مدھو کی بیٹی ضد کرتی اور وہ چڑچڑی ہو گئی تھی۔ حالات ایسے ہو گئے
تھے کہ گھر میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک ہنگامہ ہو جاتا ایسا لگتا تھا کہ مدھو کا رہنا گھر
میں کسی کو پسند نہیں تھا۔ وہ سب کے برابر میں آتی بھی نہیں تھی۔ آخر ششی اور مدھو نے
اس کوٹھی کو چھوڑ دینے کا پورا ارادہ کر لیا۔ ششی نے یہ خبر اپنے پتا جی کے سامنے بھی سنا دیا
کہہ دیا اور مدھو نے اپنی ساس کو بھی اپنے ارادے سے باخبر کر دیا۔ ان لوگوں نے تھورا
منع کرنے کے بعد اجازت دیدیا اور ششی نے ایک چھوٹا سا گھر ایک گنجان محلے میں
ٹھیک کر لیا۔ مدھو اپنے معمولی سامان ٹھیک کر کے اپنے دیور دیورانی سے ملنے کے بعد

ساس سسر کے پیر چھوئے اور اپنے نئے ٹھکانے پر آ گئی۔
مدھو کے پاس نہ صوفہ اور فریج تھے اور نہ قیمتی برتن ساس نے کچھ دینے کی خواہش ظاہر کی لیکن مدھو نے کہہ کر واپس کر دیئے کہ گھر بہت چھوٹا اور معمولی ہے۔ وہاں معمولی سامان اچھے لگیں گے اور وہ پھر دونوں میاں بیوی اس چھوٹے سے مکان میں آ گئے۔ مدھو یہاں بہت خوش تھی اپنے بچوں اور شوہر کے شوق کے کھانے بناتی اور معمولی کھانا پینا۔ معمولی رہن سہن لیکن دل کی خوشی چھپائے نہیں چھپتی۔ کوئی گاڑی اور دولت، دائی نوکروں کی بھیڑ ہر خوشی نہیں دیتی۔ یہ مدھو نے دیکھ لیا تھا۔ بچے بھی یہاں آ کر بہت خوش تھے عالیشان کوٹھی سے ان کو یہ چھوٹا سا گھر بہتر لگ رہا تھا۔ کوٹھی میں ہر وقت روک ٹوک ڈانٹ ڈپٹ سے یہ گھر بہتر لگ رہا تھا۔
مدھو بہت خوش تھی۔ ساس دیورانی اور نندوں کے تیکھے الفاظ سے دور ہو آئی تھی۔ چھوٹا سا پوجا گھر جہاں بیٹھ کر مدھو اپنے پتی اور بچوں کے لئے پراتھنا کرتی اور اچھی اور عزت کی زندگی کے لئے بھگوان کا شکر ادا کرتی۔

کس کا گناہ

آج احمدی کے شوہر کے انتقال کو دس سال گذر گئے۔ ان دس سالوں میں احمدی نے کتنی تکلیفیں اُٹھائیں اور کس حالت میں اس نے سسر کا سہارا لیا جن لوگوں سے ان لوگوں نے منہ پھیر لیا تھا۔ پھر ان ہی لوگ کام آئے ورنہ چار عدد بچوں کو لے کر وہ کہاں رہتی۔ ساس سسر کا سہارا تھا ورنہ دنیا کا تو ایسا تلخ تجربہ ہوا تھا احمدی کو جو لوگ اس کے شوہر کے آگے پیچھے کرتے تھے سب نے نظر ملانا ہی چھوڑ دیا۔
اکرام صاحب کا اکلوتا بیٹا شمیم جسے والدین نے بہت ناز نعمت کے ساتھ پرورش کیا تھا حالانکہ اکرام صاحب کچہری کے پیش کار تھے اور بہت کم پڑھے لکھے تھے

۔اس لئے سوسائٹی اور رشتہ داروں کے درمیان ان کی اہمیت بہت ہی کم تھی۔اکرام صاحب کی دلی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح بھی ہو اپنے بیٹے کو افسر بنائینگے۔اس لئے انہوں نے شمیم کا داخلہ اچھے اسکول میں کرایا تھا اور اس کی پڑھائی پر پورا پورا دھیان دیتے تھے۔خود تو اکرام صاحب معمولی کام کرتے رہے لیکن وہ اپنے بیٹے کو سوسائٹی میں سر اُٹھا کر جینے کے لائق کر دینگے۔چاہے اس کے لئے اُنہیں آدھی روٹی کیوں نہ کھانی پڑے۔اکرام صاحب اور ان کی اہلیہ سادی زندگی گذارنے کے عادی تھے لیکن بیٹے کو ان لوگوں نے کوئی کمی نہیں ہونے دی اور اسے خوش دیکھ کر والدین خوشی محسوس کرتے اور بہت فخر سے اُس کی خوبیوں کو بتاتے۔شمیم تھا بھی بہت اچھا۔وہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ کھیل، مضامین، مقالے اور تقریر سب کے مقابلے میں انعام لیتا تھا۔اکرام صاحب اور ان کی اہلیہ بہت فخر سے اپنے بیٹے کے بارے میں سب سے بتاتے اور اس کے ملے ہوئے انعام سب کو دکھانے میں خوشی محسوس کرتے۔

شمیم نے بہت اچھے نمبروں سے میٹرک پاس کیا۔والدین کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔اسکول کے استاد، محلے والے، رشتہ دار مبارکباد دینے آئے۔اکرام صاحب کی بیوی نے گھر میں لڈّو بنا کر سب کا منہ میٹھا کیا۔سب لوگوں نے اس ہونہار بچے کی شاندار کامیابی کی خوب خوب تعریف کی جسے سن سن کر اکرام صاحب اور ان کی اہلیہ کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔

شمیم کی خواہش کے مطابق شمیم کا داخلہ پٹنہ سائنس کالج میں ہو گیا۔پیسوں کی مجبوری ضرور ہوئی جسے پورا کرنے کے لئے شمیم کی والدہ نے اپنے کچھ زیور بھی فروخت کر دئے اور پھر پٹنہ کے سائنس کالج میں پڑھنے کے لئے اچھے کپڑے بھی ہونے چاہئے۔اس کا بھی انتظام کر دیا گیا اور شمیم کی پڑھائی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔آئی.ایس.سی.میں بھی اوّل نمبر لانے کے لئے شمیم نے خوب محنت کی اور اسے کامیابی

بھی ملی۔اب شمیم انجینئرنگ کے مقابلے کے امتحان میں بیٹھا اور پہلی بار میں ہی اس کا نتیجہ کافی اچھا نکلا۔شمیم کی والدہ نے انجینئرنگ کالج کے داخلے کے لئے بھی اپنے باقی زیور بیچ دیئے۔اچھے کپڑے اور جوتے کا انتظام کیا۔شمیم انجینئیر نگ کے امتحان میں امیازی نمبروں سے پاس ہوگیا۔

انجینیر نگ کا امتحان پاس ہوتے ہی اس کو نوکری اچھی سی مل گئی۔ پٹنہ میں نوکری ملتے ہی اتنے رشتہ دار اور ناطے والے پیدا ہو گئے اور لوگوں کا سلسلہ ملنے والوں کا شروع ہوگیا۔اپنی اپنی بیٹیوں سے منسوب پیش کرنے لگے۔اکرام صاحب اور ان کی اہلیہ کو بھی بیٹے کے سر پر سہرا بندھا دیکھنے کی خواہش بہت زیادہ تھی لہٰذا جلد ہی ایک خوبصورت اور تعلیم یافتہ لڑکی سے شمیم کا عقد سادگی کے ساتھ کر دیا گیا۔لڑکی کے والدین بہت معمولی آمدنی کے تھے۔ لہٰذا ان لوگوں نے بھی زیادہ تکلف نہیں کیا۔اکرام صاحب اور ان کی اہلیہ نے یہ سوچا کہ معمولی گھرانے کی لڑکی ان لوگوں کا خیال کریگی اور ان لوگوں کا بڑھاپا اچھے سے گذر جائیگا۔یوں تو شمیم کی منسوب بڑے بڑے گھرانوں سے آئی بلکہ لڑکی والوں نے دوڑ لگادی۔مگر اکرام صاحب کو پیسے کے لئے کوئی اپنے بیٹے کو داؤ پر لگانا نہیں چاہتے تھے۔ابتک جو پریشانیاں اور تکلیفیں ان لوگوں نے اُٹھائی تھیں۔خواہش تھی کہ باقی زندگی اچھے سے گذر جائے لیکن ہوا اس کے برعکس۔شمیم کی بیوی احمدی نے سسرال میں قدم رکھتے ہی یہ گھر چھوٹا اور ساس سسر احمق نظر آنے لگے۔سروس جوائن کرتے ہی شمیم کو بڑی کوٹھی اور اردلی چپراسی مل گئے اور سب لوگ اس نئی کوٹھی میں آ گئے۔ نئے نئے فرنیچ اور شان وشوکت کی زندگی جو اکرام صاحب کو ٹھیک نہیں لگتی تھی لیکن بیٹے کی خوشی کے لئے وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ آ گئے۔

اکرام صاحب اور ان کی اہلیہ کچھ زیادہ ہی سادی زندگی گذرانے کے عادی

تھے۔ شمیم اپنے دوستوں سے اکرام صاحب کو ملانا نہیں چاہتا تھا لوگوں پر اس کا اثر خراب ہوگا۔ اپنے والدین کا اس طرح سادگی میں رہنا شمیم کو بھی ٹھیک نہیں لگتا۔ گھر میں نوکر دائی۔ گاڑی ڈرائیور سب تھے لیکن اکرام صاحب خاموش رہتے۔ دونوں میاں بیوی نے اپنی زندگی کو کمرے میں قید کرلیا تھا۔ شمیم بھی والدین سے دور اور بیوی سے نزدیک ہوتا جارہا تھا۔ اسے اپنے والدین کی کمزوری اور کمی نظر آتی۔ بات بات میں روک ٹوک سے اکرام صاحب اوران کی اہلیہ پریشان ہوجاتے تھے۔ شمیم کے دو بچے بھی ہوگئے۔ اکرام صاحب کبھی بیٹے سے اپنی پریشانیوں کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ شمیم اور احمدی اُن کو خاص اہمیت نہیں دیتے۔ جب کبھی اکرام صاحب اوران کی اہلیہ اپنے ان دنوں کو یاد کرتے جب ان لوگوں نے کس پریشانی سے شمیم کو پڑھایا تھا۔ یہ سب سن کر شمیم نے جواب دیا۔

"دنیا کے ہر والدین اپنی اولاد کو اپنی حیثیت سے زیادہ تعلیم دیتے ہیں۔ اگر ابو پڑھے لکھے ہوتے اور اچھی سروس میں ہوتے تو کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ ان کے غیر تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ کر سب پریشان ہوتی۔ ورنہ ایک بیٹے کو پڑھانے میں کیا پریشانی کی بات تھی۔ شمیم نے اعلیٰ تعلیم حاصل کیا ہے اور اچھی سروس میں ہوں۔ اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دونگا۔ اس میں احسان کیا ہے؟

اکرام صاحب یہ سب سن کر دل مسوس کر رہ گئے۔ شمیم کے والدین نے بیٹے کی تعلیم، کھانے پینے اور ہر آرام کا دھیان دیا اچھی پرورش کی لیکن شاید مذہب سے اچھی طرح روشناش نہیں کرایا۔ جس کی وجہ کر آج شمیم اس طرح کی باتیں کرنے لگا ہے۔ آخر کہیں تو ان کی پرورش میں کمی تو ضرور رہ گئی ہے جو لڑکا شادی کے بعد اس قدر بدل گیا۔

اسی ذہنی پریشانی میں اکرام صاحب کے چار سال کسی طرح گذر گئے حالانکہ

ایک دن بھی ان لوگوں کا اچھے سے نہیں گذرا۔ شمیم اوراس کی اہلیہ احمدی کے بعض جملے اس قدر تکلیف دہ ہوئے جو اکرام صاحب کے کلیجے کو چھلنی کر دیتے۔

کسی کے آنے پر شمیم اور اس کی اہلیہ اکرام صاحب اور ان کی اہلیہ کو ہٹ جانے کا اشارہ کرتے اور اوہ لوگ اپنے کمرے میں سمٹ جاتے۔ یہ لوگ بار بار سوچتے کہ کیا وہ لوگ اس قدر بے وقوف ہیں جو کسی سے ملنے کے لائق نہیں ہیں۔ ایک دن اکرام صاحب نے بیٹے سے پوچھ لیا کہ ہم لوگوں کو اتنا بیوقوف کیوں سمجھا جاتا ہے؟ شمیم نے جواب دیا۔

''آپ لوگ تو اپنے آپ کو بدلینگے نہیں نہ بول چال میں۔ نہ رہن سہن میں نہ کپڑے لتے میں نہ طور طریقے میں۔ اس لئے مجھے آپ لوگوں کو اپنے ملنے والوں سے ملانے میں خراب لگتا ہے۔ ملنے آنے والوں میں سب افسر اور بڑے بڑے لوگ ہیں۔ اپنے آپ میں آپ لوگ تبدیلی لاتے تو ٹھیک رہتا لیکن یہ ممکن نہیں ہوگا کیونکہ آپ احساس کمتری میں مبتلا ہیں۔ آپ لوگوں کی عادت دبک کر رہنے کی ہوگئی ہے۔ ابا جو زندگی بھر افسر کے سامنے سر جھکا کر رہنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ظاہر ہے وہ کس طرح سے اپنے کو بدل سکتے ہیں۔'' شمیم کی یہ سب باتیں سن کر اکرام صاحب کو بہت تکلیف ہوئی اور انہوں نے بیٹے کو جواب دیا۔

''میری عمر ستر سال ہوگئی ہے۔ اس عمر میں کیا ہم لوگ بدل سکتے ہین۔ کوشش تو کیا لیکن کامیابی نہیں ہوئی اور تم لوگوں کو ہم لوگ کو بیوقوف نظر آتے ہیں۔ تم لوگوں کو ہم لوگوں کی وجہ کر شرمندگی محسوس ہوتی ہے اس لئے اب ہم لوگوں کو یہاں سے ہٹ جانا بہتر ہوگا۔ مجھے جو پنشن ملتی ہے وہ ہم لوگوں کے لئے کافی ہے گھر بھی ہے۔''

یہ کہہ کر دونوں میاں بیوی اپنے پرانے گھر میں آ گئے شمیم اور ان کی اہلیہ نے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ دونوں روتے رہے۔ پوتا پوتی کو پیار کر کے رشتے سے ان

لوگ اپنے سامان کے ساتھ اپنے چھوٹے سے گھر میں آ گئے۔ یہاں آ کر ان لوگوں کو ایک سکون ملا۔ روز روز کے طعنے اور طنز سے وہ لوگ گھبرا گئے تھے۔ آتے وقت بس ان لوگوں کو پوتے اور پوتی کے چھوڑنے کا افسوس ضرور ہوا۔ اس اس چھوٹے سے گھر میں اکرام صاحب کو سکون تو ضرور ملا لیکن بار بار ان کو شمیم اور اس کے دونوں بچے یاد آتے رہے۔ نئی نویلی دُلہن نے آ کر کون سا جادو کر دیا جوان کا بیٹا پرایا ہو گیا۔ سسرال سے آئے لوگوں کی خاطر ہوتی اور شمیم کے والدین دیکھ دیکھ کر خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے۔

سب کچھ اچھے سے چل رہا تھا کہ اکرام صاحب کو خبر ملی کہ شمیم بہت بیمار ہے۔ فطری بات تھی کہ شمیم کے والدین سن کر بے چین ہو گئے۔ خاص طور پر ماں بہت زیادہ پریشان ہو گئیں لیکن ان لوگوں کی خودداری سے ان لوگوں کے قدم شمیم کے گھر جانے کے لئے نہیں اُٹھے۔ دو سالوں میں شمیم اور اس کی بیوی بھی ساس سسر کے پاس آنے کی تکلیف گوارہ نہیں کی تھی۔

شمیم کی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی دوا علاج دوا ٹونے ٹوٹکے سب ہوئے لیکن شمیم کی حالت روز بروز بگڑتی گئی۔ ماں باپ کو وہ شدت سے یاد کر رہا تھا۔ لوگوں کے کہنے سننے پر ماں باپ اس کے پاس گئے تو ضرور لیکن پرانی باتوں کو بھلا کر بھی ان کے دل کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔

شمیم والدین کو دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا اور اس کی روح پرواز کر گئی۔ گھر کا عجیب خراب ماحول تھا بزرگ والدین، جوان بیوی اور معصوم بچے دیکھتے رہ گئے اور شمیم کا جسم بے جان سو گیا۔ سب لوگ کہہ رہے تھے کہ والدین کو ناراض کرنے کا نتیجہ نکلا۔ اللہ رحم کرے اب کیا ہوگا؟

دو ماہ تو کسی طرح گذر گئے اور پھر شمیم کی بیوی احمدی اپنے چھوٹے

چھوٹے بچوں کو لے کر ساس سسر کے اس چھوٹے سے گھر میں لوٹ آئی جس گھر کا اُس نے مذاق اُڑایا تھا اس گھر میں اس کو آ کر رہنا پڑا تھا۔ جو لوگ شمیم سے ملنے کو آیا کرتے تھے سب تعذیت کے بعد کہاں چلے گئے اور آخری سہارا ساس سسر کا تھا جس کا ان دونوں نے خوب مذاق اُڑایا تھا۔ گو شمیم کے والدین کے لئے عبرت کا مقام تھا کہ جوان بیٹے نے ان کا ہمیشہ کے لئے ساتھ چھوڑ دیا تھا لیکن اپنی زندگی میں ہی تو شمیم نے والدین کو کوئی عزت اور آرام تو دیا نہیں تھا۔ اکرام صاحب سوچتے شاید ہمارے گناہ کی سزا سے بیٹے پر مجھے بہت گھمنڈ ہو گیا تھا اور میں بڑی شان سے اس کی تعریف کرتا تھا۔ شاید خدا کو بُرا لگا ہے۔

احمدی نے ساس سسر سے لپٹ کر خوب معافی مانگی اور ان کی ذمہ داریوں میں ساتھ دینے کے لئے معذرت کیا اور سب مل کر بچوں کی پرورش میں لگ گئے۔ احمدی کو مائکے سے کوئی مالی مدد تو ملی نہیں۔ بس ایک ساس کے گھر کا سہارا تھا اور ہوا بھی وہی۔ تکلیف سے ہی صحیح مگر بچوں کی پرورش ہونے لگی۔ دس سالوں سے احمدی نے ہزار پریشانی اُٹھائی لیکن ساس سسر کا سہارا بہت بڑا سہارا تھا۔ اکرام صاحب اور ان کی اہلیہ بچوں کو کلیجے سے لگا کر تسلّی محسوس کرتے اور بچے احمدی ان لوگوں کی خدمت میں تسلّی محسوس کرتی اور احمدی یہ سوچتی شاید میرے گناہوں کی سزا مجھے مل گئی ہے۔

کچھ اکرام صاحب کا پنشن اور کچھ شمیم کا پنشن سب ملا کر کسی طرح زندگی کی گاڑی چل رہی تھی۔ بچے دادا دادی کے سائے میں پرورش پا رہے تھے۔ جوان بیوہ بہو اور معصوم یتیم بچوں کو دیکھ کر اکرام صاحب اور ان کی اہلیہ کا کلیجہ پھٹ جاتا لیکن سوچتے شاید انہیں کے کسی گناہ کی سزا خدا نے ان لوگوں کو دی ہے۔ احمدی سوچتی تھی کہ اس کی گناہوں کی سزا خدا نے اس صورت میں دیا ہے۔ اکرام صاحب اور ان کی اہلیہ سوچتی کہ شاید ہم لوگوں کے گناہوں کی سزا خدا نے دیا ہے۔

ساٹھا تو پاٹھا

آج شمی باجی کا فون کاشمیر سے آیا تھا۔ وہ وہاں بہت خوش ہیں۔ بیس سال ان کی شادی کو ہو گئے اس درمیان وہ برابر ہم لوگوں کو یاد کرتی رہتی تھیں۔ ایک دو بار اپنے شوہر کے ساتھ پٹنہ ہم لوگوں سے ملنے بھی آئیں۔ ان کا فون اور خط آتا تو ہم سب خوش ہو جاتے۔ اب تو ان کی بیٹی بھی اٹھارہ سال کی ہو گئی ہے۔ بہت ہی خوبصورت اور نازک سی۔

شمی باجی نے جو تکلیفیں بچپن سے اُٹھائی ہیں۔ اللہ نے ان کو اس کا اجر دیا ہے۔ نیک اور خوبصورت شوہر، پیار کرنے والا سسرال، کھاتا پیتا گھرانہ ملا ہے۔ شمی باجی کے برداشت کا جواب نہیں اور اسی برداشت اور تکلیف اٹھانے کے بدلے میں اللہ نے ان کو خوشیاں بخش دی تھیں۔

اب سے بیس سال پہلے گھر میں کچھ کھلبلی سی لگ رہی تھی۔ ہمارے دادا جان ایک شادی میں شرکت کے لئے جہان آباد گے تھے لیکن وہ دوسرے دن دُلہن اور ان کی نابینا دادی کو لے کر پٹنہ لوٹ آئے۔ ہم لوگوں کے سمجھ میں کچھ نہیں آیا معاملہ ہے کیا۔ شمی باجی کی شادی ہونے والی تھی اور یہاں کیوں آگئیں۔ شمی باجی جس وقت سے آئی تھیں خاموشی سے کمرے میں بیٹھی تھیں۔ ہم لوگوں نے اپنی باجی جان کو جاسوسی کرنے کو تیار کر دیا اور باجی جان بہت اہم جانکاریاں لے کر آئیں۔

باجی جان ہم لوگوں کو بتایا شمی باجی کی امی اور ابو مین طلاق ہو گئی تھی۔ شمی باجی کے ابو بہت ہی بے فکرے انسان ہیں۔ زندگی بھر زمینداری اور زمین بیچ کر کھایا جب ہاتھ خالی ہو گیا تو اِدھر اُدھر وقت گذارتے اور شعر و شاعری کرتے رہے۔ خالی خولی شعر و شاعری سے زندگی تو گذرتی نہیں ہے۔ گھر مین ہر وقت چھوٹے

جھگڑے ہونے لگے اور آخر میں ابو امی کی طلاق ہوگئی۔ دادی اور امی گھر میں سلائی کرتیں اور ہم لوگوں کے اخراجات اس طرح پورے ہوتے۔ دادی کی آنکھیں سلائی کر کے اور رو رو کر چلی گئیں۔ اور امی کا اچانک انتقال ہوگیا۔ اب میں دن بھر سلائی کرتی اور زندگی کی گاڑی کسی طرح چلا رہی تھی۔

معلوم ہوا کہ شمی باجی کے ابو نہایت خدی اور غیر ذمہ دار انسان ہیں۔ کوئی سمجھانے کی کوشش کرتا تو وہ سخت ناراض ہو جاتے۔ جب شمی باجی کی عمر اٹھائیس سال ہوگئی تو لوگوں نے شمی باجی کے ابو کو سمجھانے کی کوشش کیا کہ لڑکی کی ذمہ داری کو سمجھیں اور جلد اس کی شادی کر دیں۔ پھر پٹنہ خبر آئی کہ شمی باجی کی شادی طے ہوگئی۔ دادا جان چند رشتہ داروں کے ساتھ جہان آباد کے لئے روانہ ہو گئے۔ جہان آباد جا کر ان کو معلوم ہوا کہ شمی باجی کی شادی ساٹھ سال کے آدمی کے ساتھ طے ہوگئی ہے۔ یوں تو وہ نقلی دانت لگا کر بالوں میں خزاب لگا کر جوان بننے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ پہلی بیوی مر چکی ہے اور کوئی اولاد نہیں ہوئی ہے۔ جہان آباد کا رئیس ہے۔ کافی زمین اور جائیداد ہے۔ شمی باجی کے ابو نے سب کو سمجھا دیا کہ مرد کی عمر کیا ہوتی ہے۔ ساٹھا تو پاٹھا۔ روپئے پیسوں کی کوئی کمی نہیں لڑکی رانی بن کر رہے گی۔ گو اس شخص کو کئی بیماریوں نے جکڑ لیا تھا اور ہمیشہ بیماریوں کی باتیں معلوم ہوتی تھیں۔ شمی باجی کے ابو کے سامنے کون آواز اٹھائے۔ اس لئے سب لوگ سب کچھ دیکھ کر بھی خاموش تھے۔ اس شخص نے شمی باجی کے ابو (احمد صاحب) کی برابر مالی مدد کیا ہے اس کے عوض میں وہ ان پر مہربانی کر کے اپنی بیٹی قربان کر رہے تھے۔ شمی باجی کے ابو بار بار کہہ رہے تھے کہ لڑکا ساٹھ کا ہے تو کیا ہوا۔ ساٹھا ہے تو پاٹھا ہے۔ اس جملے سے شمی باجی کو نفرت ہونے لگی تھی۔ لفظ وہ سننا نہیں چاہتی تھی۔ شمی باجی نے اپنی دُکھ بھری کہانی ہماری باجی جان کو سنائی اور انہوں نے ہم سب کو ساری باتیں سنائی۔

شمی باجی نے بتایا وہ روتی رہیں۔ کھانا پینا چھوڑ دیا لیکن اس کا کوئی اثر ان کے ابو پر نہیں ہوا۔ جب ہمارے دادا جان شمی باجی کو شادی میں شرکت کے لئے پہنچے تو شمی باجی نے ان کو اور دو تین بزرگوں کو اندر بلوایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ انہوں نے سب سے سوال کیا کہ آپ کے گھر میں آپ لوگوں کی لڑکیوں کے ساتھ ایسا ہوتا تو کیا آپ لوگ اس کو برداشت کرتے یہ کہہ کر وہ اور بھی پھوٹ پڑیں۔ سب لوگوں پرس کا بہت اثر ہوا اور فوراً شادی روکنے کے لئے زور دینے لگے لیکن شمی باجی کے ابو اس کے لئے بالکل تیار نہیں تھے۔ شمی باجی کے ابو نے لڑکے سے ایک لاکھ روپیہ لے کر اپنی بیٹی کا سودا کر دیا تھا۔ وہ کہاں سے لوٹایا جائیگا۔ پھر سب بزرگوں نے آپس میں طے کیا کہ دس دنون میں یہ پیسے جس طرح بھی ہو واپس کر دئے جائینگے۔ ہمیشہ خاموش رہنے والی شمی باجی نے کہاں سے ہمت جٹا کر اتنی ہمت کی ان کا جواب نہیں۔ سب بزرگ لڑکے والے کے یہاں پہنچ گئے۔ دُلہا بابو دلہا بنے باجے بارات روانہ ہونے والی تھی۔ گاجے باجے کے ساتھ گھوڑی پر چڑھنے کو تیار تھے۔ یعنی بارات روانہ ہونے والی تھی۔ بنے ٹھنے خوش وخرم دُلہا کو جب شادی رکنے کی خبر ہوئی تو وہ سخت ناراض ہو گئے اور پہلے تو شادی روکنے کو تیار نہ تھے اور جب ناامید ہو گئے تو اپنے پیسے لوٹانے کی ضد کرنے لگے کسی طرح دس دنوں کی مہلت لی گی اور پھر دادا جان شمی باجی اور ان کی نابینا دادی کو لے کر پٹنہ آ گئے۔ کسی طرح سب لوگوں نے انتظام کر کے ایک لاکھ روپیہ بڑے میاں کو واپس کر دیا۔ خاندان والوں نے مل کر پیسے واپس کر دیئے لیکن اب شمی باجی کی شادی کا مرحلہ ہو گیا۔ ہمارے دادا جان کے یہاں پھل کا تجارت کرنے والے دو باپ بیٹے آئے تھے اور برابر ٹھہرتے تھے۔ برسوں سے ان کے آنے اور ٹھہرنے کا سلسلہ تھا۔

دونوں باپ بیٹے نہایت شریف اور نیک تھے۔ ہمارے دادا جان نے جو

ساری باتیں عبیدلون کو سناتی تو وہ اپنے بیٹے محامرلون سے شمی باجی کے لئے عقد کے لئے تیار ہو گئے اور بہت سادگی کے ساتھ شمی باجی کا عقد عامرلون سے ہو گیا۔ شمی باجی کو سب نے تحفے دئے اور بہت ساری دعائیں۔ جسے لیکر وہ سسرال روانہ ہو گئیں۔ شمی باجی اپنی نابینا دادی کو بھی ساتھ لے گئیں۔ شمی باجی کے ابو نے شرکت نہیں کی۔

آج شمی باجی کا سسرال میں ایک اچھی خوشحال زندگی گذر رہی ہے۔ عمر کے اٹھائیس سالوں تک جس تکلیف اور ذہنی الجھن میں انہوں نے زندگی کے سب اونچ نیچ کو برداشت کرتی رہیں۔ خاموش رہیں۔ اٹھائیس سالوں تک زندگی اور حالات سے سمجھوتا کرکے رہیں۔ آج اللہ نے انہیں خوشی بخشی ہے۔ جب عمارلون اور عبیدلون پٹنہ آتے شمی باجی کی خوب خوب تعریفیں کرتے اور ہم لوگوں کو بہت تسلی ہوتی۔ دادا جان نے ایک معصوم کی زندگی کو بچالیا۔ شمی باجی کو تو ان کے برداشت کا اجر مل گیا اور ہمارے دادا جان کو بھی خدا جنت الفردوس میں جگہ ملی ہوگی۔ آج کے دور میں تو لڑکیاں اچھے بُرے کا فیصلہ خود کرتی ہیں لیکن آج سے بیس سالوں قبل ایک چھوٹی سی جگہ کی ان پڑھ لڑکی نے اتنا بڑا اقدم اٹھا کر اپنی زندگی کو بھینٹ چڑھنے سے بچالیا۔ ان کی ہمت قابل تعریف ہے۔ ویسے شمی باجی ساٹھا تو پاٹھا کو ضرور یاد کرتی ہیں جواب دنیا میں نہیں ہیں۔

دو کشتی کے مسافر

کسم کی جوان بیٹی فردوس کی لاش اس کے سامنے پڑی تھی۔ کسم کو تو جیسے سکتا سا لگ گیا تھا نہ آنکھ سے آنسو بہہ رہے تھے اور نہ منہ سے آواز نکل رہی تھی۔ جس بیٹی کو اس نے جان سے بھی زیادہ عزیز رکھا تھا اس کی تھوڑی سی تکلیف سے بھی کسم بے چین ہو جاتی تھی۔ جس کی ہر خواہش کو پوری کرنے کے لئے وہ بے چین ہو جاتی تھی۔ اس

لڑکی نے اتنا بڑا اقدم کیوں اُٹھالیا۔ کون سی تکلیف کون سے غم نے اسے کھالیا۔

میں اٹھارہ سالوں سے ان لوگوں کے نزدیک ہوں کسم اور فہیم اپنے عشق کی کہانی ہمیشہ مجھے سناتے رہتے تھے۔ کسم اپنے شوہر فہیم سے دو تین سالوں سے الگ رہ رہی تھی۔ کسم کی شادی اب سے اٹھارہ سال قبل ہوئی تھی۔ فہیم اور کسم میڈیکل کالج میں ساتھ پڑھتے تھے۔ دونوں میں دوستی تھی اور پھر عشق میں دونوں نے دھرم اور مذہب کے بارے میں سوچے بغیر اپنے چند دوستوں کی موجودگی میں کورٹ میں شادی کرلیا۔ حالانکہ دونوں کے خاندان والے کٹر مذہبی تھی کچھ دنوں تو دونوں نے شادی کی بات کو پوشیدہ رکھا لیکن پاس کرنے کے بعد جب دونوں کو سروس ہوگئی تو یہ راز بھی فاش ہو گیا۔ کسم ایک خوبصورت اور بڑے گھر کی مہریانہ کی لڑکی تھی جب کے فہیم یو. پی. کے پرانے خاندان کا لڑکا تھا۔ دونوں خاندان والے لوگ بہت پرانے خیالات والے تھے۔ اپنے اپنے مذہب کے بنا پر دونوں خاندان والے اس قدر ناراض تھے کہ شروع سے ہی ان لوگوں کی دوستی پر ناراضگی تھی۔ دونوں کے خاندان والوں سے ان لوگوں کو الگ کرنے کی بھرپور کوشش کی لیکن وہ لوگ کامیاب نہیں ہوئے۔

جب شادی کی خبر کسم کی ماں کو ہوئی تو اس کی کیفیت پاگل جیسی ہوگئی۔ کسم کے، جہیز اور تلک کے سامان جو انہوں نے انتظام کر کے رکھا اسے باہر پھینکنا شروع کیا اور رو رو کر بددعائیں دیتی جاتی۔ بار بار وہ کہہ رہی تھی جس طرح کسم نے مجھے رلایا ہے بھگوان اسے بھی کسی دن رلائیگا۔ دونوں کے خاندان والوں نے ملنا جلنا یہاں تک کہ ان لوگوں کا ذکر کرنا بھی چھوڑ دیا بلکہ رشتہ داروں تک سے کہہ دیا کہ جو لوگ کسم اور فہیم سے ملے گا وہ لوگ ان لوگوں سے بھی رشتہ ختم کر دینگے۔

فہیم اور کسم بہت خوش تھے۔ دونوں کی بحالی بنگلور کے ایک اسپتال میں ہوگئی۔ ان لوگوں کو کبھی نہ خاندان والوں کی یاد آئی اور نہ مصروفیت نے ان لوگوں کو کچھ

سوچنے کا موقع دیا۔ایک سال کے اندر ان لوگوں کے یہاں ایک پھول سی بچی نے جنم لیا جس کا نام ان لوگوں نے فردوس رکھا۔دو سال میں ایک بیٹا بھی ہو گیا جس کا نام ان لوگوں نے فاروق رکھا۔ بچے بڑے ہونے لگے اور ساتھ ان کے سوالات بھی بڑے ہونے لگے۔ بچے اکثر اپنے دادا۔ دادی اور نانا۔ نانی کے بارے میں پوچھنے لگتے تھے۔ جب ان لوگوں کے دوست کے دادا۔ دادی اور نانا۔ نانی آتے تو بچے اپنے والدین سے اپنے دادا۔ دادی۔ نانا۔ نانی کے نہ آنے کی وجہ دریافت کرتے اور کبھی تو ان لوگوں کے پاس جانے کی ضد کرتے۔ کسم اور فہیم نے کئی بار بچوں سے فون کرانے کی کوشش کی مگر ان لوگ جواب نہیں دیتے۔ بچوں نے خط بھی لکھا مگر جواب نہ آئے پر بچے سخت مایوس ہو گئے۔

ڈاکٹر کا سخت محنت کا پیشہ اس پر ذہنی الجھن نے کسم اور فہیم کو چڑ چڑا بنا دیا تھا۔ بچوں کے سوالات کے جواب دینے میں دونوں کتراتے اور کبھی کبھی تو ناراض بھی ہو جاتے۔ اکثر کسم اور فہیم میں بھی نوک جھونک ہونے لگتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے پر الزام بھی لگانے لگے تھے۔ زندگی کی اصلیت جب سامنے آئی تو زندگی گھناونی لگنے لگی تھی۔

دونوں بچے بڑے ہو رہے تھے اپنے آس پاس کے ماحول دیکھ عجیب محسوس کرنے لگتے تھے۔ بچے اپنے دوستوں کے یہاں پوجا یا عید بقرعید دیکھتے تو ان لوگوں کو عجیب سا محسوس ہوتا تھا۔ جب وہ والدین سے سوال کرتے تو ان لوگوں کا یہ جواب کہ ہم لوگ نہ ہندو ہیں اور نہ مسلمان۔ ہم لوگ انسان ہیں اور انسانیت کا پیشہ ڈاکٹری کر رہے ہیں۔تھوڑی دیر کے لئے وہ لوگ خاموش ہو جاتے مگر پھر وہی سوال والدین سے کرنے لگتے۔ان حالات کو دیکھ کر فہیم اور کسم نے بچوں کو ہاسٹل میں رکھ دیا۔لیکن وہاں بھی فردوس بے چین رہی۔ بار بار گھر آ جاتی اور پھر دوبارہ بہت مشکل سے ہی

واپس جاتی۔ فردوس بہت زیادہ حساس لڑکی تھی۔ کوئی ساتھی بھی اس سے الٹے سیدھے سوال کرتی تو بے چین ہو جاتی۔ کھانا پینا چھوڑ دیتی۔ پرنسپل صاحبہ بار بار والدین کو بلا کر اسے گھر لے جانے کا مشورہ دیتی تھیں۔

آج جب کسم کو اپنی جوان بیٹی کی لاش دیکھنے کو ملی تو اس کے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ اسے بار بار بے ہوشی طاری ہو رہی تھی۔ ہوش آتا تو پھر چلانے لگتی۔ ممی پاپا میرے پاس آجاؤ میں بہت دکھی ہوں۔ دادا نے مجھے آتے وقت یہ کیسی بددعا دی تھی کہ میں ان لوگوں کو رُلا کر جا رہی ہوں تو میں بھی کسی روز روؤنگی''

محلے والوں نے اس نازک موقع پر بہت مدد کیا پولس آئی۔ لاش اتاری گئی اور فردوس کا وہ خط بھی مل گیا جس میں اس نے اپنی موت سے قبل اپنے والدین کو لکھا تھا۔

''ممی پاپا میں زندگی کا خاتمہ کر رہی ہوں مجھے ایسا لگتا ہے میں بیچ منجدھار میں غوطے کھا رہی ہوں۔ بے سہارہ محسوس کرتی ہوں۔ اس سے بہتر مر جاتا۔ فاروق تو لڑکا ہے باہر کی دنیا میں اس کا دل بہل جاتا ہے۔ تین سالوں سے پاپا الگ ہیں۔ پاپا سے دوری اور آپ کی مصروفیت، لوگوں کی عجیب عجیب باتیں سن کر میں سہہ نہیں پائی۔ ممی پاپا آپ دونوں دو کشتی کے مسافر لگتے ہیں اور بیچ میں ہم لوگ غوطے کھا رہے ہیں۔ میں اپنی موت کی ذمہ داری خود لیتی ہوں اور کوئی ذمہ دار نہیں ہے۔'' ممی پاپا مجھے معاف کر دیں۔

پولس لاش لے کر چلی گئی، فہیم کو خبر کی گئی وہ بھی آ گیا تین سالوں سے وہ لوگ الگ رہ کر اپنی اپنی زندگی گذار رہے تھے لیکن آتے ہی کسم فہیم سے چمٹ گئی، پاگلوں کی طرح چلانے لگی۔ فہیم بھی فردوس سے بہت زیادہ پیار کرتا تھا۔ فردوس اس کی بہت چہیتی بیٹی تھی۔

فہیم نے کبھی فردوس کو کوئی تکلیف نہیں ہونے دی۔ ادھر تین سالوں سے وہ الگ ضرور رہ رہا تھا لیکن فردوس کو دیکھنے اس کے لئے تحفے لے کر ضرور آتا تھا۔ فون پر دونوں میں خوب باتیں ہوتی تھیں لیکن فردوس نے اتنا بڑا اقدم اٹھانے سے قبل کیوں اس نے اپنا دکھ درد نہیں بانٹا۔

فہیم انے اپنے اور کسم کے گھر والوں کو فون سے خبر کر دیا لیکن کس نے ایک جملہ کہہ کر اس کے غم میں شامل ہونے کی تکلیف گوارہ نہیں کی۔ لاش کے ساتھ پولس فردوس کا ایک ہندی میں خط بھی ساتھ لے گئی۔

دوسرے دن صبح لاش پوسٹ مارٹم کے بعد آ گئی لیکن محلے والوں کا یہ سوال کہ لاش قبرستان جائینگی یا شمشان گھاٹ۔ یہ فیصلہ تو والدین کو کرنا تھا لیکن مسجد کے امام صاحب نے فتوہ دیدیا کہ لاش سپرد خاک کی جائیگی کیونکہ بچی کے والد مسلمان تھے۔

محلے کی عورتوں نے فردوس کو تیار کر دیا۔ کسم نے فردوس کی آخری رخصتی کے وقت چلا رہی تھی وہ الماری سے اپنی بنارسی ساری لال رنگ کی نکال کر فردوس کو اڑھا دیا۔ چلا رہی تھی فردوس کو دلہن بنا کر بھیجو ہماری بیٹی کی رخصتی ہو رہی ہے۔ اس کو جلانا مت بچی ہماری بہت نازک ہے وہ آگ برداشت نہیں کر پائیگی۔ اس کی سمادھی پر تاج محل بنوا دینا۔

کسم اور فہم دو کشتی کے مسافر ہو گئے تھے لیکن اس غمگین دونوں لپٹ کر چلا چلا کر رو رہے تھے۔ اتھاہ آنسو بہہ رہے تھے۔ ان لوگوں کی اس کیفیت کو دیکھ کر محلے والے بھی رو گئے۔ کسم بیٹی کو لپٹا کر پیار کرتی جا رہی تھی۔ بڑی مشکل سے لوگوں نے اسے الگ کیا اور تب فردوس کی ڈولی اُٹھی۔ غیروں کے بھی آنسو بہہ نکلے۔

ابّا، امّاں بلا رہیں ہیں

ظفر بھیا کی بارات چلنے کی تیاری ہو رہی تھی رشتہ دار دوست محیب سب جانے کو تیار کھڑے تھے۔ بارات لکھنو جا رہی تھی اس لئے لوگ سامان وغیرہ کے ساتھ آئے ہوے تھے۔ اندر سے عورتوں کے گیت کی آواز آرہی تھی۔

ظفر بھیا اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے اس لئے ان کی دلہن کھوجنے میں بہت دیر ہوئی۔ ظفر بھائی کی والدہ رشیدہ پھوپھی کو ایسی بہو چاہیے تھی جو خوبصورت خوب سیرت ساتھ موٹے آسامی کی بیٹی بھی ہو۔ ایک ہی بیٹے میں سب شوق پورا کرنا تھا۔ رشیدہ پھوپھی نے رشتے داروں ملنے والیوں میں یہاں تک کہ جگہ جگہ کالجوں میں بھی لڑکی دیکھی کہ اچھی لڑکی مل جائے تو وہ مسلمان کے کسی ذات کی لڑکی سے بھی شادی کر لیں گی لیکن افسوس انہیں کامیابی نہیں ملی۔ ظفر بھائی بینک میں سروس کرتے تھے۔ اچھے عہدے پر تھے تنخواہ بھی اچھی ملتی تھی۔ لڑکی کھوجتے کھوجتے ظفر بھائی کی عمر چھتیس سال ہوگئی۔ آخر رشیدہ پھوپھی نے لکھنو میں لڑکی تلاش کر ہی لیا۔ لڑکی ایم۔ اے پاس خوبصورت اور خوب سیرت بھی اور کافی مالدار گھرانے کی۔ رشیدہ پھوپھی نے شادی کی زبردست تیاری کی کپڑے اور زیور کا دل کھول کر انتظام کیا آخر ان کی اکلوتی اولاد کی شادی تھی۔ جب لکھنو منگنی کرنے گئیں تو وہاں ہونے والی بہو کے ساتھ اس کی پسند کی خریداری کی۔ ظفر بھائی بارہ سالوں سے بمبئی میں رہ رہے تھے سال میں ایک یا دو بار والدین سے ملنے پٹنہ آتے تھے۔ نہ والدین کبھی بمبئی گئے اور نہ ظفر بھائی نے ان لوگوں کو کبھی بمبئی آنے کے لئے کہا۔ گھر کا ہر فرد شادی کی خوشی میں خوش تھا سوائے ظفر بھائی کے۔ وہ بہت سست اور خاموش خاموش سے تھے۔ لوگوں نے سمجھا ذمہ داریوں کا بوجھ سر پر آنے والا ہے اسی لئے شاید ان پر اثر ہے۔ لیکن کسی

نے اس معاملے میں غور وفکر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ ہر رسم میں ظفر بھائی نے مخالفت کی اس پر لوگوں نے قیاس لگایا کہ وہ ان سب دقیانوسی باتوں کو پسند نہیں کرتے۔

بارات کی روانگی کا وقت آ گیا۔ٹھیک اسی وقت گیٹ کے سامنے ایک رکشہ آ کر رکا۔اس میں ایک خوبصورت سی کمسن سی عورت بیٹھی تھی اور ایک آٹھ نو سال کا لڑکا بھی تھا جو رکشہ سے اتر کر ٹھیک ظفر بھائی کے پاس آ گیا اور رکشے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا '' ابا، اماں بلا رہی ہیں''۔ سب لوگوں نے سمجھا شادی میں شرکت کرنے کے لئے رشتہ دار آئیں ہوں گی اور ان کا بچہ ظفر بھائی کو ابا کہتا ہوگا۔ظفر بھائی لڑکے کو دیکھتے ہی گھر میں داخل ہو گئے۔انہیں پسینے آنے لگے، چہرے کی رونق جاتی رہی۔اس رکشے کے بعد دو رکشے اور آئے جس میں دو چار بزرگ عورت اور مرد بھی تھے۔سب نے آتے ہی ظفر بھائی کو طلب کیا ظفر بھائی بہت مشکل سے گھر سے باہر آئے۔آنے والے بزرگوں میں سے ایک نے ظفر بھائی کا کالر پکڑ لیا اور دوسرے نے دھکا مشتی شروع کی۔ یہ سب باتیں اوروں کی سمجھ سے بالاتر تھیں کہ آخر کیا ماجرا ہے۔ان لوگوں نے بتایا کہ ظفر میاں نے اب سے نو سال قبل بمبئی میں ایک خوبصورت لڑکی سے عقد کر لیا تھا اور ایک آٹھ سال کا بیٹا بھی تھا۔رشیدہ پھوپھی کو خبر ہوئی تو وہ بیہوش ہو گئیں گھر کا ماحول بدل گیا۔لڑکی خود بھی رکشے سے اُتر کر آئی اور سب نے مل کر خوب ہنگامہ مچایا۔ لڑکی کے والد نے بتایا سال میں دو یا تین لاکھ روپیہ دینے سے ہم لوگ ان کی غلطی کو کب تک چھپاتے رہیں گے۔ ہماری بیٹی نے تو اسلام مذہب بھی قبول کر لیا اس پر بھی دوسری شادی کرنے چلے ہیں۔سب نے مل کر ظفر بھئی کو نوچ ڈالا۔کسی نے پگڑی اُتار کر پھینک دی تو کسی نے سہرا نوچ ڈالا۔ کسی نے تو ان کے امام ضامن کھول ڈالا۔مختصر یہ کہ ظفر بھائی سہرے مکنے کے ساتھ پٹا گئے۔ کپڑے سارے نوچ ڈالے

گئے۔ سب گالیاں دے رہے تھے ''بڑے باپ کا بیٹا شادی رچانے چلا ہے''۔

اب ظفر بھائی کے ابا منور پھوپھا کو پتہ چلا کہ ظفر بھائی بینک کی نوکری کے بعد بھی کنگال کیوں رہتے تھے مقروض کیوں رہتے تھے اور اکثر اپنے والد صاحب سے پیسے منگاتے تھے۔ چانکہ منور پھوپھا کے پاس پیسے کی کوئی کمی نہ تھی اس لئے کبھی انکار نہ کرتے لیکن آج اصلیت کا پتہ لگ گیا تھا۔ ہنگامے ہو رہے تھے کچھ باراتی حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اپنا سامان لے کر کھسک گئے کچھ تماشہ دیکھنے رک گئے۔ اب پتہ چلا کہ ظفر بھائی نے اتنے دنوں اپنے والدین کو کیوں نہیں بتایا۔ کچھ لوگ منور پھوپھا کے پاس آ کر ان کو سمجھانے لگے لیکن وہ سخت ناراض تھے۔ رشیدہ پھوپھی بیہوش تھیں انہیں نیند کا انجکشن بھی دلوایا گیا۔

منور پھوپھا نے زبان کھولی اور بیٹے کو بلا کر کہا ''تم اپنی اہلیہ اور سسرال والوں اور اپنی اولاد کے ساتھ میرا گھر فوراً چھوڑ دو یہ شریفوں کا گھر ہے کمینوں کا نہیں۔ میں کسی بھی قیمت میں غیر مسلم لوگوں سے رشتہ قائم نہیں کر سکتا۔ تم نے دس سال ہم لوگوں کو اندھیرے میں رکھا۔ میرے دل میں تمہارے لئے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ تم جلد سے جلد اس گھر کو چھوڑ دو۔ اس لڑکے نے صرف ہماری دولت کے لالچ میں مجھ سے اس بات کو چھپا کر رکھا۔

کچھ ہی دیر میں ظفر بھائی اپنے پورے سسرالی قافلے کے ساتھ والد صاحب کے پاس آ کر معافی مانگنے لگے لیکن منور پھوپھا نے ان لوگوں سے باتیں کرنا بھی بہتر نہ سمجھا۔ سب کے سمجھانے بجھانے کے باوجود منور پھوپھا نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا اور جلد سے جلد گھر چھوڑ دینے کا حکم دیا۔ انہیں معلوم تھا کہ رشیدہ پھوپھی کو ہوش آ جائے گا تو ماں کی ممتا کے آگے وہ کمزور پڑ جائیں اور اپنا فیصلہ نہ بدل دیں۔ ظفر بھائی ماں کے پاس گئے مگر ماں بیہوش اور کچھ غنودگی کی حالت میں تھیں۔ ظفر بھائی روتے ہوئے

اپنے سسرالی قافلے کے ساتھ باہر کی طرف نکلنے لگے لیکن بار بار ان کی نگاہ والد کی طرف اُٹھ رہی تھی کہ شاید انہیں رحم آ جائے۔

منور پھوپھا نے لکھنو فون کر کے ساری باتیں بتا دیں اپنی شرمندگی کا ذکر کیا اور معافی مانگی اور رونے لگے اور اپنے فیصلے پر اڑے رہے۔ وہ اپنے نالائق بیٹے کو کسی طرح معاف کرنے کو تیار نہیں تھے۔ منور پھوپھا دھیرے دھیرے اپنے کمرے کی طرف جانے لگے کچھ رشتہ دار بھی ان کے پاس آ گئے۔

منور پھوپھا نے زور سے پکارا ''دیکھو وہ منحوس لوگ گیا کہ نہیں اور نہیں تو گھر سے دھکے دے کر نکال دو۔ اس کمبخت نے دو۔ دو خاندان کو دھوکا دیا ہے۔ منور پھوپھا اپنے بستر پر بے جان سے پڑ گئے اور یہ شیر پڑھا:

نہ تو میں کسی کا حبیب ہو نہ تو میں کسی کا رقیب ہوں
جو اُجڑ گیا وہ دیار ہوں جو بکھر گیا وہ نصیب ہوں

منور پھوپھا بولنے لگے ''ایسے لڑکے کو میں ہرگز معاف نہیں کروں گا جس نے مجھے ہی نہیں بلکہ اچھے بھلے خاندان کو بھی ذلیل کیا ہے۔ لکھنو میں کیسی پریشانی ہوئی ہو گی خدا ان لوگوں کی پریشانی دور کرے اور اس معصوم لڑکی کی قسمت اچھی بنائے آمین''۔

دیکھ کبیرا رویا

بچپن میں میں جس محلے میں رہتی تھی مسلمانوں کی گجان آبادی تھی اور قریب قریب سب ہی غیر تعلیم یافتہ تھے۔ زیادہ تر مرد میونسپلٹی آفس میں چوتھے درجے کے ملازم تھے۔ گھر میں نہ تعلیم کا رواج تھا اور نہ اچھا طور طریقہ۔ لڑکے زیادہ تر گولیاں کھیلتے یا گلی ڈنڈے کھیلتے۔ لڑکیاں چھوٹی سی عمر میں گھر کے کام کرتیں۔ ماں بچے پیدا کرتیں اور لڑکیاں ان کی دیکھ بھال میں لگی رہتیں۔ چھوٹی سی عمر سے لڑکے سائیکل، رکشے وغیرہ

کی مرمت کے کام میں لگ جاتے اور کچھ سکے ماں باپ کے ہاتھ میں رکھ دیتے۔ والدین اسی میں خوش ہو جاتے۔

مجھے تو میری دادی جان محلے میں کسی کے ساتھ کھیلنے نہیں دیتیں لیکن کبھی کبھی لڑکیاں خود ہی میرے ساتھ گڑیا کھیلنے آجاتیں لیکن ان لوگوں کی زبان اس قدر خراب تھی کہ دادی جان کو ان لوگوں کے ساتھ ہماری دوستی بالکل پسند نہیں تھی۔ ہماری دادی جان کو محلے کی عورتیں کھالہ (خالہ) کہا کرتی تھیں۔

اکثر عورتیں نیاز کی مٹھائی یا حلوہ لے کر دادی جان کے پاس آتیں کیونکہ سیدہ بی بی کے نیاز کا کھانا ہماری دادی جان ہی کھا سکتی تھیں کیونکہ وہ سیدانی تھیں اور اس کھانے کو سید ہی کھا سکتے تھے۔ کبھی کبھی دادی جان مجھے بھی کھانے کو دے دیتیں تھیں۔

پورے محلے میں کوئی پڑھا لکھا تو تھا نہیں اکثر عورتیں پوسٹ کارڈ لے کر آتیں اور مجھ سے خط لکھواتیں۔ خط کا القاب اور مضمون اتنا مزیدار ہوتا کہ کیا بتاؤں۔ ایک درجن لوگوں کو سلام اور دعائیں لکھوایا جاتا مجھے تو بڑی ہنسی آتی۔

برابر رات کے وقت کسی گھر سے عورت کے رونے چلانے کی آوازیں آتیں اور دادی جان بے چین ہو کر اُٹھ جاتیں۔ دادی اماں پریشان ہو کر کہتیں لگتا ہے ستار سلمہ کو مار رہا ہے۔ سلیم جو ہمارا پرانا بہی خواہ تھا اسے زبردستی بھیج دیا جاتا اور منہ بنا کر واپس آجاتا اور کہتا۔

سلیمہ تو بڑے اطمینان سے مار کھا رہی تھی اور کہنے لگی تم لوگ بیچ میں کاہے کو بولو ہو۔ میرا سوہر (شوہر) ہے مار رہا ہے کوئی ایرے غیرے تھوڑا نہ ہے۔ وہ کھلاتا پہناتا ہے تو اس کا حک (حق) ہے مارنے کا اور میرا بھرج (فرض) ہے کہ کچھ نہ بولوں۔

یہ سلسلہ رونے چلانے کا برابر ہوتا لیکن دادی جان بے چین ہو جاتیں اور کبھی

کبھی تو زبردستی سلیم کو بھیج دیتیں اور وہ ڈانٹ کھا کر واپس آ جاتا۔ ہماری دادی جان کہتیں سب ہمارے سامنے کی پیدا عورتیں مار کھاتی ہیں تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا ہے۔''

جب یہ عورتیں دادی جان کے پاس آ کر روتی ,تکلیف کا ذکر کرتیں اپنے چوٹ دکھاتی تو مجھے اس قدر غصہ آتا کہ دو چار چپل میں بھی لگا دوں۔ جب یہ جھک کر مار کھا لیتے ہیں تو شکایت کرنے کا کوئی حق نہیں۔

میں چودہ پندرہ سال کی ہو چکی تھی عورتوں کے حقوق اور فرض کو سمجھنے کے لائق ہو چکی تھی۔ اس لئے اور ہی غصہ آتا۔ عورت چاہے جس طبقے کی کیوں نہ ہو شوہر سے اتنے اطمینان سے مار کھائے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

اس محلے میں میونسپل میں کام کرنے والوں کے علاوہ بیڑی بنانے والے ،رکشے چلانے والے،ٹم ٹم چلانے والے رہتے تھے وہ رات میں نشے میں گھر آتے اور پھر ہنگامے کرتے۔ میں اس وقت تک یہ سوچتی تھی کہ مسلمان تاڑی نہیں پیتے ,نشا نہیں کرتے لیکن مجھے اپنی رائے بدلنی پڑی اور ایسے مسلمانوں کو دیکھ کر میں کانپ جاتی تھی۔ مگر یہاں تو پورا محلہ ہی اس رنگ مین رنگا ہوا تھا۔

میں کلام پاک معنی کے ساتھ پڑھتی تھی اور یہ ذہن میں تھا کہ مسلمان کو شراب کا نام لینے سے ہی گناہ ہوتا ہے۔

عام طور پر ہر ماہ کے آخر میں کسی نہ کسی دروزے پر ہنگامے ہوتے۔ گالی گلوج ہوتے سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا معاملہ ہے۔ دادی جان نے بتایا۔

''جب محلے کے لوگوں کو پیسے ملتے ہیں۔ مہینے کے پہلے ہفتے میں تو گوشت اور مچھلی کھاتے ہیں۔ پیسے کم ہونے لگتے ہیں تو دوسرے ہفتے میں سبزی کھانے لگتے ہیں اور پیسے کم ہونے لگتے ہیں تو نمک روٹی اور بھات کھاتے ہیں اور چوتھے ہفتے میں

ہاتھ خالی ہوجاتا ہے تو وہ گالیاں کھاتے ہیں ادھار اور قرض والوں سے''۔

میں نے دادی اماں سے سوال کیا آخر شروع میں یہ لوگ پیسوں کے حساب کیوں نہیں رکھتے جو آخری ماہ میں گالیاں کھانے کی نوبت آجاتی ہے۔''

اس محلے کی عورتیں جب آپس میں جھگڑنے لگتی ہیں تو ایسے فحش گالیاں بکتیں ہیں کہ شرم آتی ہے۔ عورتیں بڑے شوق سے بتاتیں کہ اُن کے کتنے بچے ہیں۔ کسی کسی کے آٹھ اور دس تک بچے تھے۔ جو نالی کے کیڑوں کی طرح رینگتے رہتے۔

ایک دن دادی جان نے فیصلہ لیا کہ یہ نسل تو جیسے تیسے گذر رہی ہے لیکن اگلی نسل کو ٹھیک کیا جاسکتا ہے اور اس سلسلہ میں ہم لوگوں نے چند اردو کا قاعدہ اور سلیٹ منگایا اور محلے کے بچوں کو بلایا تاکہ انہیں کچھ پڑھایا جاسکے لیکن عورتیں محلے کی ناراض ہوگئیں اور کہنے لگتیں۔

ہم غریب لوگ ہیں۔ گھر میں دائی نوکر کے کام کے لئے ہیں۔ لڑکیاں گھر کا کام نہیں کرینگی تو کون کریگا۔ ان لڑکیوں کو وکیل تو بنانا ہے نہیں۔ چھوٹی سی عمر میں اس محلے کی لڑکیاں گھر کے کام کے علاوہ چھوٹے بھائی بہن کی دیکھ بھال کرتیں تھیں اور ہم لوگ اُنہیں سلیٹ اور اُردو کا قاعدہ لے کر بیٹھے رہ گئے۔ مجھے تو ان کے حالات پر رونا آیا۔ لڑکیاں اپنے بچپن کو بھول کر بچوں کو کھلاتی ہیں۔ لڑکے چھوٹی سی عمر میں رکشے اور سائیکل مرمت کرکے چند سکے ماں باپ کی ہتھیلی پر رکھ دیتے اور وہ لوگ ان کی کامیابی پر خوش ہوجاتے تو پھر اُنہیں تعلیم کی کیا ضرورت تھی۔

اگر بھولے بھٹکے کوئی بچہ آجاتا اور ہم لوگ پڑھانے کی کوشش کرتے تو دوسرے دن سے وہ غائب ہوجاتا اور ہم لوگ انتظار کرتے رہ جاتے۔ اسکول اور [illegible] کی پڑھائی کے بعد میں ان بچوں کو پڑھانے کا وقت نکالتی اور جب ۔۔۔ فائدہ اُٹھانے کی کوشش نہیں کرتے تو مجھے بہت افسوس ہوتا۔

ان عورتوں کی حرکتوں اور گالیوں کی بوچھار دیکھ کر دادی جان نے محلے کی مسجد کے مولوی صاحب کو بلا کر عورتوں کو سمجھانے کے لئے کیا عورتوں کو بھی بلایا گیا۔ مولوی صاحب کے سامنے عورتوں نے احتجاج کیا اور کہنے لگیں۔

''یہ مولوی ہم لوگوں کو کیا سمجھائیگا۔ یہ تو خود جھوٹا ہے اور ٹونٹکی کرتا ہے۔ بیوی کو گالیاں دیتا ہے۔ گھر کا خیال نہیں کرتا اس کی بیوی تو خود روتی رہتی ہے۔ یہ مولوی تو دنیا کو دیکھانے کو روزہ نماز کرتا ہے۔''

ہم لوگ ہمت ہار چکے تھے بس سوچتی تھی اللہ ان لوگوں کے حال پر رحم کرے ہم لوگوں کی یہ کوشش رائیگاں گئی۔ ہم لوگوں کے نصیب میں ان لوگوں کو ٹھیک کرنا نہیں لکھا ہے۔

ہاں جہاں تک تقریب کا معاملہ تھا وہ تو برابر ہوتی۔ کبھی کہیں سے عقیقہ کی بلاہٹ آتی یا پھر ختنہ کی۔ شادی تو اور بھی دھوم دھام سے ہوتی۔ خوب خوب ہنگامے۔ عورتیں زمین میں پیسے دبا کر رکھتیں اور خوب خوب دھوم مچاتیں۔ مجھے جانے کی اجازت تو تھی نہیں۔ بس اپنے کوٹھے سے تماشے دیکھتی رہتی تھی۔ ہاں زیادہ تر گھروں سے کھانا ہم لوگوں کے لئے ضرور آجاتے تھے۔ لیکن کھانے کی مجھے بالکل خواہش نہیں ہوتی بس سب کے حال پر رونے کا دل چاہتا تھا۔

پچھلے پچاس سالوں سے میرا اس محلے سے تعلق ختم ہو چکا ہے لیکن خبر ملتی رہتی ہے۔ سنا ہے اب تک وہی حال ہے۔ درجنوں بچے سڑک پر کھیلتے رہتے ہیں۔ جوا اور شراب کا بازار گرم ہے۔ کتنے بچے جو ہمارے سامنے پیدا ہوئے تھے وہ بوڑھے ہو گئے اور بوڑھوں نے تو دنیا کو الوداع کہہ دیا۔

یہ سب سن سن کر پھوٹ پھوٹ کر رونے کی خواہش ہوتی۔ کاش میں ان لوگوں کے لئے کچھ کر پاتی۔ جب مسلمان اپنی بربادی خود چاہتے ہیں تو کون سمجھا سکتا

ہے ان کو۔ گندگی اور افلاس کی مارنے کو بے حس بنا دیا ہے۔ سرکار نے سڑک بنوا دیا ہے لیکن آدھی سڑک پر گھوڑے کا امبار جمع رہتا ہے۔ کارپوریشن والے ملازمین سال کے چھ ماہ ہڑتال پر رہتے ہیں۔ یوں بھی یہاں کے لوگ افلاس میں رہنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ان لوگوں کے حال پر آنسو ہی بہایا جا سکتا ہے اور کچھ کہا نہیں جا سکتا ہے۔

پنچھی چگ چگ جائے

آج پھر موہنی اور اس کی ساس سے بحث ہو گئی۔ پچھلے بیس سالوں سے ساس بہو کی اکثر بحث ہو جاتی تھی اور موضوع صرف موہنی کا پتی شیکھر ہوتا یہ سلسلہ پچھلے بیس سالوں سے چلا آ رہا تھا۔ نہ موہنی خاموش رہتی اور نہ اس کی ساس برداشت کرتیں اور نہ شیکھر کی فطرت میں کوئی تبدیلی ہوتی۔ دونوں ساس بہو بحث کرتیں کبھی موہنی رو دیتی اور کبھی اس کی ساس رونے لگتیں۔ پھر دونوں غصہ ہو کر سو جاتیں کچھ دیر گھر میں خاموش رہتی اور پھر دونوں میں سے کوئی اُٹھ کر بچوں کے کھانے کا انتظام کرنے میں لگ جاتیں یا کبھی کبھی تو دونوں کھانے کے انتظام میں لگ جاتیں۔

شیکھر اپنی ماں کا بہت دلارا تھا کیونکہ شیکھر کی پیدائش اس کے باپ کے مرنے کے دو ماہ بعد ہوئی تھی۔ ماں نے بہت جتن سے اس کی پرورش کی تھی لیکن پیار کا تیل مسالہ کچھ زیادہ پڑ گیا تھا جس کی وجہ کر شیکھر کی فطرت میں من مانی اور غیر ذمہ داری آ گئی تھی۔ بچپن سے جوانی تک اس کی فطرت وہی رہ گئی اور یہی چیز اس کی شادی شدہ زندگی میں زہر گھول رہی تھی۔

شیکھر کی ماں اور بیوی کے درمیان جب بھی بحث ہوتی شیکھر موضوع بحث رہتا۔ شیکھر کی ماں بیٹے کی طرفداری کرتیں اور موہنی اپنی پریشانیوں کا ذکر کر کے رونے لگتی۔ شیکھر کی ماں بہو پر الزام لگاتیں کہ اس نے سختی نہیں کی۔ موہنی بولتی ''آپ

کا بیٹا کوئی گائے بکری تو تھا نہیں جسے میں باندھ کر رکھتی۔ وہ شروع سے کھلا سانڈ ہے۔ سانڈ عادت تو آپ نے ہی بگاڑ دی ہے۔

موہنی کی ساس کہتی ''مرد پنجڑے میں بند کر کے رکھنے والا پنچھی نہیں ہوتا وہ آزاد پرندہ ہے وہ تمہاری قید میں کیسے رہ سکتا ہے''

موہنی جواب دیتی ''آزاد پنچھی کی شادی کر کے کسی کی زندگی برباد کرنے کی ضرورت کیا تھی؟''

موہنی سوچتی واقعی میں شیکھر ایک آزاد پنچھی ہے کبھی اِس ڈال پر کبھی اُس ڈال پر کبھی کسی ۔کے چھجے پر کبھی کسی کے ورآمدے میں کبھی مسجد کے گمبند پر کبھی مندر کے مینارے پر کبھی کسی کے صحن میں اور کبھی کسی کے بالکونی میں دانہ چگنے والا پنچھی۔ شیکھر کی اسی عادت کی وجہ کر موہنی پچھلے بیس سالوں سے پس رہی ہے اور ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دب کر رہ گئی ہے۔ موہنی کو شیکھر کے ساتھ اپنی ساس سے ناراضگی رہتی جس نے اپنے بیٹے کو ایسا غیر ذمہ دار بنا دیا تھا۔ شیکھر آفس کے بعد یا چھٹی کے دنوں میں گھر سے غائب رہتا۔ کہاں جاتا ہے کہاں رہتا ہے کہاں کھاتا ہے۔ گھر میں کسی کو خبر کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتا۔ حد تو یہ ہوگئی کہ دو دو تین تین دنوں تک گھر سے غائب رہتا اور گھر میں کسی کو کوئی خبر نہیں رہتی۔

گھر کی ذمہ داریوں کا تو اسے احساس ہی نہیں ہوتا اور پھر موہنی سارا غصہ ساس پر نکالنے لگتی۔ موہنی اپنی ساس سے کہتی۔

''آپ کو تو پتی کا سکھ کبھی ملا ہی نہیں مجھے بھی اس سکھ سے محروم کر دیا۔ آپ کی لگائی ہوئی گندی عادتوں نے شیکھر کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ چار بچے ہو گئے ہیں لڑکیاں دونوں بڑی ہو رہی ہیں۔ لڑکے اپنے باپ کی ان حرکتوں سے کیا سبق حاصل کرینگے۔ میں بھی سروس کرتی ہوں آفس سے سر کھپا کر آتی ہوں اور گھر میں بھی ذمہ داریاں

اُٹھاتی ہوں۔ کیا میں انسان نہیں ہوں۔ کیا شیکھر کی ذمہ داری نہیں ہے کیا وہ پینگ گیسٹ ہیں۔ ہر ماہ چند نوٹ پکڑا کر اپنی ذمہ داریوں سے کنارے ہو جاتے ہیں۔ شیکھر کیا کماتا ہے اور کیا کرتا ہے۔ گھر میں کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ سوائے گھر کے تھوڑے خرچ کے ہر ماہ دیتا۔ جب موہنی غصہ ہوتی تو اپنی ساس کو کھرے کھوٹے سنانے لگتی اس کی ساس بیچاری خاموشی اختیار کر لیتی اور کبھی کبھی بحث بھی کرنے لگتیں۔ موہنی کی پریشانیوں کا ایک حد تک وہ اپنے کو ذمہ دار ضرور مانتی تھیں لیکن بیٹے کے خلاف بولنے کا دل گوارہ نہیں کرتا تھا۔

بچپن سے تو شیکھر کو دس گھر کے دانے چگنے کی عادت پڑ گئی تھی اور اب یہ عادت اس حد تک ہو گئی کہ اسے چھڑانا ممکن تھا نہ ماں اور نہ بیوی کے لئے۔

موہنی اپنی بہنوں۔ رشتہ داروں اور دوستوں کو دیکھتی کہ وہ لوگ شادی کے بعد کس قدر خوش رہتی ہیں۔ سب اپنے اپنے شوہر کے ساتھ گھومتی اور ہر بات میں رائے مشورے کرتیں۔ زندگی کے ہر سکھ دکھ کو باٹتی ہیں لیکن شیکھر کو تو ان سب باتوں سے کوئی مطلب بھی نہیں تھا۔ پہلے تو ماں کے ساتھ اکیلے رہتا تھا۔ اس لئے سیلانی بن گیا تھا۔ ماں سوچتی تھی کہ شادی کے بعد وہ ٹھیک ہو جائیگا لیکن شیکھر کی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اب تو عمر کے ساتھ اس کی عادت ایسی پختہ ہو گئی ہے کہ چھڑایا نہیں جا سکتا۔

شیکھر بچپن سے آزاد زندگی گذارنے کا عادی ہو گیا تھا۔ وہ کہاں جاتا کہاں رہتا، کب گیا، کب آیا کچھ پتہ نہیں لگتا اور نہ گھر میں کسی کو بتانے کی تکلیف گوارہ کرتا۔ ایک مخصوص رقم دیکر وہ ہر ماہ اطمینان کر لیتا اور اپنے فرض سے سبکدوش ہونا سمجھتا۔ ایسی حالت میں موہنی کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی اور وہ غصہ ہوتی۔ بچپن سے ایک آزاد پنچھی سے موازنہ کیا گیا تو وہ خاصیت اس کی زندگی میں ہمیشہ کے لئے رہ گئی

بلکہ مرد ہونے کا ایک غرور بھی شامل ہو گیا۔ احساس برتری نے اسے جکڑ لیا تھا اور خود کو بدل دینا ممکن نہ تھا۔ جگہ جگہ کے دانے چوگنا اس کی عادت ہو گئی تھی۔

کبھی کبھی تو موہنی کا دل چاہتا وہ شیکھر کا سر توڑ دے ساس کا گلا دبا دے اور وہ بچوں کے ساتھ خودکشی کر لے لیکن بچوں کا منہ دیکھ کر ان پر رحم آ جاتا۔ ایک پڑھی لکھی عورت ہونے کے ناطے یہ سب کرنے کی ہمت نہیں جٹا پاتی اور پھر زندگی اسی طرح چلنے لگتی۔

شیکھر کی ماں بھی موہنی کی پریشانیوں سے اثر لیتی اور افسوس کرتی اپنے بیٹے کی حرکت پر غصہ آتا اور خود اپنے پر بھی جس نے شروع سے بیٹے پر سختی نہیں کیا اور کبھی موہنی کو اپنی بوڑھی ساس پر رحم آنے لگتا۔ غصے میں وہ اس بوڑھی عورت کو برا بھلا کہنے لگتی ہے۔ پچھتاوا بھی دونوں کو اپنی اپنی جگہ پر ہوتا۔ بیچاری بوڑھی عورت کو اس عمر میں کوفت ہو رہی ہے۔ شیکھر کی ماں سوچتی میری بہو کو کوئی خوشی نہیں ملی جس کا سخت افسوس ہوتا ہے۔ کبھی موہنی کی ساس بیمار ہو جاتی اور کبھی موہنی بیمار رہتی لیکن گھر کی ذمہ داریوں کو وہ لوگ کس طرح پورے کر دیتیں۔ شیکھر پر تو بولنے اور سمجھانے کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ بچوں کی وجہ کر دونوں اپنی اپنی جگہ مجبور تھیں۔ بچے بھی گھر کے حالات کو دیکھ دیکھ کر پریشان ہو جاتے۔ کبھی ماں رو رہی ہے اور کبھی دادی لیکن شیکھر کو ان سب کی پریشانیوں اور تکلیف سے کوئی ہمدردی تو تھی نہیں وہ گھر آتا۔ کھانا کھاتا اور آرام کی نیند سو جاتا۔ روز صبح دس بہانے بنا کر گھر سے نکل جاتا۔ شیکھر کے پاس گھر کی پریشانیوں کے بارے میں سننے کی فرصت کہاں تھی۔

کبھی کبھی تو شیکھر کی ماں بہو پر طعنوں کے بوچھار کر دیتیں "میں نے تو شیکھر کو کھونٹے سے باندھ دیا تھا پر ڈور اتنی کمزور تھی کہ غلطی ہے کہ تم اسے سختی سے باندھ نہیں سکیں۔ بچپن سے اس کے پیر گھر میں نہیں ٹکتے تھے سوچتی تھی شادی کے بعد

ٹھیک ہو جائے گا لیکن دیکھ رہی ہوں کہ عمر کے ساتھ شیکھر کی عادت اور خراب ہو رہی ہے۔ میں اب کیا کر سکتی ہوں۔'

شیکھر کی ماں رونے لگتیں اور پھر وہ بولنے لگتیں میں نے تو واقعی میں پتی کا سکھ نہیں دیکھا۔ شادی کے چند دنوں کے بعد شیکھر کے پتا بیمار پڑ گئے اور بیماری بڑھتی گئی اور دو سال بھی نہیں ہوئے تھے کہ وہ پرلوک سدھار گئے۔ دو سال تو پتی کے سیوا میں گذر گئے ان کے مرنے کے دو مہینہ بعد شیکھر کا جنم ہوا میں سب دکھ بھول گئی۔ بھگوان نے بیٹا دیا ہے سکھ کے دن آئینگے اور پھول کی طرح سے اسے میں نے پرورش بڑی محنت اور جتن سے کیا ہے۔ یہی دن دیکھنے کے لئے طعنے سننے کے لئے۔ سوچا تھا بیٹے کی خوشی میں خوش رہونگی اور سب دکھ بھول جاؤنگی۔ بھگوان نے میری گود میں خوشیاں بھر دی ہیں۔"

کچھ دیر خاموش رہ کر موہنی کی ماں ٹھنڈی سانس لیتی اور پھر لولنے لگتی مجھے تو ایک بیٹا بھگوان نے دیا ہے تمہیں تو دو دو بیٹے ملے ہیں ان لوگوں کو کس کر رکھنا ورنہ کل کو تمہاری دونوں بہویں طعنے دینگی۔ ان دونوں کو ذمہ داریوں کا احساس دلانے۔ بھگوان نہ کرے یہ آزاد پنچھی نہ بن جائیں اور شیکھر کی طرح جگہ جگہ کے دانے چگنے لگیں۔ دونوں کی نکیل کس کر رکھنا۔

ساس کے خاموش ہوتے ہی موہنی بول پڑتی۔

"اتنے غیر ذمہ دار باپ کو دیکھ کر کیا بچے ذمہ دار بن جائینگے۔ میں ان لوگوں کو آزاد تو نہیں کرونگی لیکن خون کا اثر تو دکھائیگا ہی۔ پنچھی کی طرح دانے چگنے کی عادت ابھی نہیں تو کبھی تو پڑ سکتی ہے۔"

ہم دونوں ساس بہو بھگوان سے دعا تو ضرور کر سکتے ہیں کہ بھگوان نہ کرے ہمارے بچوں کو آزاد پنچھی کی طرح دانے چگنے کی عادت پڑے۔ موہنی نے روتے ہوئے کہا۔

آخری فیصلہ

کاہے کو بیاہی بدیس لکھیا بابل مورے کاہے کو بیاہی بدیس
ہم تو تھے بابل تیرے انگنے کی چڑیا چگ چگ اڑ جائے لکھیا بابل
مورے کاہے کو بیاہی بدیس لکھیا بابل مورے کاہے کو بیاہی بدیس

میراثن کی اس گیت اور ڈھول کی آواز پوری کوٹھی میں گونج رہی تھی۔ کمرے میں لڑکیوں کی گیت کی آواز بھی آرہی تھی۔

''میرے ہاتھوں میں نونو چوڑیاں ہیں ذرا ٹھہرو سجن مجبوریاں ہیں''

گھر میں رونق تھی ہر طرف ایک ہنگامہ۔ جمال صاحب کی اکلوتی بیٹی غزالہ کی شادی تھی۔ کل ہلدی کی رسم تھی پرسوں مہندی کی اور ترسوں بارات آنے والی تھی۔ زبردست ہلچل تھی بچے دانیال، دارین اور علی اپنے پینٹ قمیض کی تیاری میں تھے تو لڑکیاں علویہ، کائنات اور فرح اپنے غرارے اور شلوار کی تیاری میں تھیں۔ دوپٹے میں گوٹے لگ رہے تھے۔

جمال صاحب کی اکلوتی بیٹی غزالہ کی شادی ہونے والی تھی۔ اس کی منسوب اپنے رشتہ داروں میں ہی محلے میں ہی طے ہوگئی تھی۔ وحید صاحب کے اکلوتے بیٹے سرفراز سے طئے ہوگئی تھی لڑکا جدہ میں ڈاکٹر ہے۔ جو رشتہ دار آرہے تھے سب کو دونوں طرف شرکت کرنی تھی اس لئے ہر وقت لوگوں کا آنے جانے کا سلسلہ لگا تھا۔ یہاں کی خبر وہاں اور وہاں کی خبر یہاں آرہی تھی۔ دونوں گھروں کے لوگوں کا آپس میں خوب کھیل مذاق چل رہا تھا رات کے وقت جب سب بوا کھانے کے لئے بیٹھیں تو ان لوگوں کی آپس کی باتیں اور مذاق سننے میں خوب مزا آتا۔

تھوڑی دیر چپ رہ کر میراثن نے گیت کا سلسلہ پھر شروع کر دیا ''میں تو بابل کھونٹے کی گیا بابل مورے کا ہے کو بیاہی بدیس لکھیا بابل مورے''

جمال صاحب اندر آتے اور اپنی امی کے پاس کھڑے ہو جاتے ان کی آنکھوں میں ٹمٹماتے آنسوں ان کی امی کو نظر آ گئے انہوں نے بیٹے کو اشارہ کیا اور پیار سے سر پر ہاتھ پھیرا۔ جمال صاحب کی انکھوں سے آنسو کی دھار بہ نکلی۔ جمال صاحب کی والدہ کو بیٹے کے دل کی کیفیت کا اندازہ ہو رہا تھا انہوں نے سر پر ہاتھ رکھا اور پیار سے سمجھانے کی کوشش کی ''یہ تو دنیا کی ریت ہے پرورش تم نے کی لیکن اس زمہ داری کو بھی خوشی خوشی پورا کرنا ضروری ہے اللہ کا شکر ادا کرو کہ خاندان کا اور اس شہر کا لڑ کا تم کو مل گیا ہے۔

جمال صاحب نے جواب دیا'' ہاں اماں آپ نے درست فرمایا لیکن کیا کروں مشتری کی یاد برابر آتی ہے اس بدنصیب نے تو اپنی بیٹی کی کوئی خوشی نہیں دیکھی جس کا غم مجھے ہے''۔

ماں نے جواب دیا مشتری کی یاد ہم سب لوگوں کو آتی ہے اور تمہارے جذبات کا خیال آتا ہے، ہم کو بھی۔ بچی کو تم نے کس قدر پیار دیا ہے میری، دای اور کھلائی کی موجودگی پر بھی تم نے غزالہ کے لئے راتیں جاگ کر گزاریں ہیں۔ مشتری شادی کے بعد صرف تین سال زندہ رہی اس نے سب کو پیار دیا سب سے پیار کیا لیکن خدا کی مرض کے اگے کس کی چلی ہے تین ماہ کی بچی کو چھوڑ کر وہ چلی گئی''۔

جمال صاحب کی شادی پچیس سال کی عمر میں ہوئی تھی ان کی اہلیہ مشتری صرف تین سال زندہ رہیں۔ غزالہ کی پیدائش کے بعد مشتری کی صحت بہت خراب ہو گئی علاج میں کوئی کمی نہیں ہوئی لیکن وہ بچ نہیں سکیں۔ جمال صاحب بھی خاموش

خاموش رہے لیکن پھر سب کے سمجھانے کے بعد دھیرے دھیرے بچی میں خوشی ڈھونڈھنے لگے۔ دالی کھلائی کے موجودگی میں بھی وہ غزالہ کو گود میں لے کر ٹہلاتے رہتے۔ بچی بھی اس قدر مانوس ہوگئی تھی کہ ابو کے آنے کے وقت وہ باہر پوٹیکو میں کھڑی ہوجاتی۔ جمال صاحب گاڑی سے اترتے ہی بچی کو گود میں اٹھالیتے اور توتلی بولی سن کر خوش ہوجاتے بلکہ خود بھی اس کی توتلی بولی میں بولنے لگتے۔

عائشہ بی بی نے بہت کوشش کی کہ جمال صاحب دوسری شادی کے لئے تیار ہوجائیں لیکن وہ یہ کہہ کر ٹال جاتے ''کہاوت ہے کہ جب ماں دوسری آتی ہے تو باپ تیسرا ہوجاتا ہے اور میں تیسرا نہیں بننا چاہتا ہوں۔''

جمال صاحب کی اہلیہ مشتری بہت ہی معمولی شکل صورت کی اور معمولی گھرانے کی تھیں جمال صاحب کو نہ جہیز ملا اور نہ خوبصورتی لیکن انہوں نے بیوی کو عزت دیا۔ صرف تین سالوں میں ہی انہوں نے مشتری کو ہندوستان کے سب بڑے بڑے شہروں کی سیر کرادی لیکن بچی کی پیدائیش کے بعد ان کو انفکشن لگا کہ ہزاروں دوا علاج ہوا لیکن کسی نے زندگی نہیں بچائی۔ جمال صاحب نے مشتری کے ساتھ اپنی ایک تصویر خوب بڑی کرواکر اپنے بیڈروم میں لگالی تھی اور روزانہ اسے اپنے ہاتھوں سے صاف کرتے تھے۔

ماں نے تو جمال صاحب کو ہر طرح سمجھانے کی کوشش کی کہنے لگیں ''بیٹا دوسری شادی کرلو خدا کرے ایک بیٹا ہوجائے''۔

جمال صاحب نے جواب دیا اگر میں غزالہ کو بیٹا اور بیٹی دونوں مان لوں تو سب سے اچھا رہے گا لڑکی بناؤں گا تو غزالی کہوں گا اودلڑکا بناؤں گا تو غزال کہوں گا کیسا رہے گا امی۔ غزالہ ہمارے دل کی ٹکڑا ہے میری دوست ہے میری مشیر ہے میں

اس پر سوتیلی ماں کا غم نہیں ڈال سکتا''۔ روشن بی بیٹے کے اس جواب سے لاجواب ہو گئیں اور خاموشی اختیار کر لی۔

جمال صاحب خوبصورت اور کمسن تھے بڑے عہدے پر تھے خاندان کے کئی لوگوں نے اپنی بیٹیوں سے منسوب بھی بھیجا مگر سب بے اثر رہا۔ کئی بار تو خود روشن بی خوبصورت اور کمسن لڑکیوں کو کسی بہانے سے جمال صاحب کے کمرے میں بھیج دیتیں لیکن وہ تو کسی کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے بلکہ اپنی امی سے شکایت کرتے کہ انہیں یہ سب بالکل بھی پسند نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ان کے دماغ میں کوئی بات ہے ہی نہیں۔

جس دن غزالہ نے ام۔ اے پاس کیا اُس کی منسوب کی تلاش شروع ہو گی۔ کئی منسوب آئی بھی لیکن لڑکا سرفراز سب کو پسند تھا۔ کمزوری یہ تھی کہ دوسرے ملک میں رہتا ہے۔ جمال صاحب اسی شہر کے لڑکے سے شادی کرنا چاہتے تھے تاکہ بیٹی دور نہ جائے لیکن ایسی کوئی بھی منسوب نہ ملی جس میں سب باتیں ہوں اور اسی شہر کا بھی ہو آخر ان لوگوں کو اس منسوب کے لئے حامی بھرنی پڑی پورا خاندان تو دیکھا ہوا تھا اور پاس میں ہی رہتا تھا لیکن لڑکا صرف جدہ میں تھا۔

دھیرے دھیرے گھر میں بھیڑ بھاڑ ہونے لگی تھی کافی رشتہ دار آ گئے تھے۔ غزالہ کو اپنے ابو کی بڑی فکر رہتی ابو نے دوا کھایا کہ نہیں وہ جا کر دیکھتی۔ کھانے کا خیال خود کرتی۔ دائی نوکر کو بھی تاکید کرتی کہ بھیڑ بھاڑ میں کہیں ابو کھانے میں بدپرہیزی نہ کر لیں کہیں ان کو چینی والی چائے تو نہیں مل گئی وغیرہ وغیرہ۔

جمال صاحب نے اپنی امی سے کہا'' امی میں برابر مشتری کو خواب میں دیکھ رہا ہوں وہ کہتی ہیں کہ بیٹی کو رو کر نہیں خوشی خوشی دعائیں دے کر رخصت کرنا ورنہ

ہماری روح کو تکلیف ہوگی۔''

ماں نے جواب دیا'' ہاں بیٹا ہمارے دل میں بھی یہی خیال آتا ہے اللہ دلہن کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور تم کو صبر دے۔

ایک بار پھر گیت کی آواز گونج گئی۔

ابا میری دور سے آئی بارات چچا ہوشیار کھڑے رہنا

دادا میری دور سے آئی بارات نانا ہوشیار کھڑے رہنا

لڑکیاں ہسنے لگیں بارات تو اتنے نزدیک سے آرہی ہے بھلے بنو دور چلی جائیگی۔ ماحول پھر کچھ افسردہ ہوگیا لیکن بچوں نے ماحول بدل دیا۔ دانیال، داریں اور علی نے جمال صاحب کے سامنے آکر کہا'' چچا جان، شرط ہے دروازے چھیک نے کا ہم لوگ پانچ لاکھ روپیہ لیں گے۔ علویہ، کائنات اور فرح بھی دوڑ کر آگئیں اور بولیں'' ماموں جان، ہم لوگ جوتے چرائی کا دس لاکھ لیں گے آپ دلہے بھائی کو سمجھا دیں گے۔ جمال صاحب نے سب بچوں کو سینے سے لگا لیا اور یقین بھی دلایا کہ وہ کوشش تو ضرور کریں گے دلوانے کی۔

غزالہ کی منسوب طے ہونے کے بعد ایک دن روشن بی بی نے بیٹے کے سامنے پھر وہی کہانی شروع کی'' دیکھو بیٹا جمال غزالہ کے جانے کے بعد ہم دونوں بہت اکیلے ہو جائیں گے تم اگر کسی سیدہ عورت سے بھی عقد کرلو تو تمہاری تنہائی دور ہو جائیگی'' جمال صاحب نے جواب دیا'' امی آج کے سائنس کے دور میں کوئی کسی سے دور نہیں ہوتا میں روز غزالہ کو فون کروں گا انٹرنیٹ کے ذریعہ بات کروں گا پھر میں اکیلا کہاں ہوں چند سالوں میں ریٹائر ہو جاؤں گا اور برابر جدہ جایا کروں گا۔ امی خدا کے لئے آگے سے مجھے دوسری شادی کے بارے میں کوئی زور نہ دیں میرے دل کو بہت

تکلیف ہوتی ہے۔ میری عمر شادی کی رہی ہے کیا''۔ روشن بی بی نے کہا ''شادی تو لوگ ساٹھ ستر سال کی عمر میں بھی کرتے ہیں تم تو ابھی پچاس کے بھی پورے نہیں ہوئے ہو''۔

جمال صاحب نے جواب دیا میں فضول لوگوں کی نقل نہیں کر سکتا امی آپ مہر بانی کر کے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں میں خوش ہوں بس''۔ روشن بی بی کا یہ وار بھی خالی گیا وہ خاموش ہو گیں۔

ہلدی کا دن آ گیا عورتیں پیلے کپڑوں میں تیار ہو گئیں۔ سب لوگ خوش تھے۔ صرف جمال صاحب خاموش بجھے چپ چپ سے اور مرجھائے ہوئے تھے۔ کئی رشتہ دار اُن کی مدد کے لئے آ گئے تھے۔ اُبٹن کی رسم شروع ہوئی گیت کی آواز گونجنے لگی۔

کون لگا وے تیرا اُبٹن کون لگا وے کڑوا تیل
دادی لگا ویں تیرا اُبٹن نانی لگا ویں کڑوا تیل

اپٹن کھیلنے میں خوب دھما چوکڑی ہوئی جمال صاحب کی سالی نے بھی جمال صاحب کو اُبٹن لگایا مگر دونوں کے انکھوں میں آنسو تھے۔

دوسرے دن مہندی کی رسم تھی اور میراثن کے ساتھ گھر کی عورتیں بھی گیت گا رہی تھیں۔

گورے گورے ہاتھوں میں خوب رچیگی مہندی
گورے گورے ہاتھوں میں لال لال مہندی

جمال صاحب نے بیٹی کے ہاتھوں میں مہندی دیکھی اور اسے گلے سے لگا لیا اور دعائیں دیں۔

دوسرے دن بارات تھی صبح سے گھر کی سجاوٹ شروع ہوگئی گھر کو دلہن کی طرح سجادیا گیا تھا۔عورتیں تو کام میں لگ گئی تھیں میراثن نے اپنا عہدہ سنبھال لیا۔

دور سے چلا بنا آیا ہے دادی مت کرو ٹونا

لاڈو کا بنا آیا ہے اجی نانی مت کرو ٹونا

دوسری طرف لڑکیوں نے گانا شروع کیا

بڑے ارمانوں سے بنا آیا ہے موتی جھومی جھومی

اپنی لاڈو کے لئے ٹیکہ لایا موتی جھومی جھومی

بارات بھی خوب دھوم دھام سے آ گئی۔عقد ہوا اور عقد کے وقت بھی جمال صاحب خاموش خاموش رہے لیکن آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔دروازے چھکینے جوتے چرانے کی رسم ہوئی۔ بچے ہنگامے کرتے رہے کچھ رسم ہوئی اور پھر کھانے پینے کا سلسلہ شروع ہوگیا اور پھر صبح رخصتی کا وقت آگیا۔جمال صاحب نے بیٹی داماد کو گلے لگایا اور پھوٹ پڑے اس وقت سرفراز نے کہا ”ابو آپ کو ہم لوگ اکیلا نہیں چھوڑ سکتے ہیں۔اس عمر میں تو آپ کہیں رہ بھی نہیں سکتے اس لئے میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ میں اسی شہر میں آکر پریکٹس کروں گا اور آپ کے نزدیک رہوں گا جدہ جا کر وہاں کی سروس چھوڑ دوں گا انشاء اللہ۔ داماد کے منہ سے یہ الفاظ سن کر جمال صاحب رو پڑے اور اسے سینے سے لگالیا۔

ہر شخص جمال صاحب کی تعریف کر رہا تھا جس نے ایک اولاد کے سہارے ساری جوانی گزاردی اللہ نے اس کا اجر انہیں دیا ہے۔

جمال صاحب کی والدہ جو وہاں کھڑی تھیں بول اٹھیں جمال کا فیصلہ بالکل درست تھا صحیح تھا۔

خاموش سسکیاں

آرزو بوا جب اسحاق صاحب کے گھر کام کرنے آئیں تو اُن کی بیٹی چاندنی صرف چھ ماہ کی تھی ۔ آرزو بوا کے شوہر نے انہیں بہت تکلیفیں دیں اور پھر دوسری شادی رچالی۔ کسی نے آرزو بوا کو اسحاق صاحب کے گھر لا کر کھانا بنانے کے کام پر رکھوا دیا۔ ارزو بوا کو نوکروں والا کمرا مل گیا۔ دھیرے دھیرے آرزو بوا نے باورچی خانے کا کل کام سنبھال لیا۔ بہت دلچسپی اور ہمدردی سے کام کرنے لگیں تھیں۔ آرزو بوا کے علاوہ اسحاق صاحب کے یہاں ایک نوکر باہر کا کام کرنے کے لئے ، ایک دائی جھاڑو پوچھا اور برتن دھونے کے لئے ، ایک جمعدارن باہر کی صفائی کے لئے اور ایک ڈرائیور بھی تھا۔ اسحاق صاحب کی اہلیہ صنوبر بی ایک نیک عورت تھیں۔ ان کی گود میں بھی دوسال کی بیٹی نغمہ تھی۔ اسحاق صاحب کی اچھی خاصی تجارت تھی جس کے سلسلہ میں وہ اکثر کلکتہ اور کانپور بھی جاتے رہتے تھے۔ کافی آمدنی تھی اور سب کی زندگی بہت سکون سے گزر رہی تھی۔ آرزو بوا کی بیٹی چاندنی نغمہ سے زیادہ تندرست اور اچھی لگتی تھیں ۔ دھیرے دھیرے دونوں چلنے لگیں ۔ دونوں ساتھ مل کر کھیلتیں جسے دیکھ کر اسحاق صاحب اور ان کی اہلیہ صنوبر خوب خوش ہوتے۔ صنوبر کو نغمہ کے بعد دو بیٹے بھی ہوئے جن کا نام ان لوگوں نے عروج اور عارف رکھا۔ جب نغمہ اور چاندنی قریب پانچ سال کی ہوگئیں تو دونوں کا داخلہ اسکول میں ہوگیا نغمہ کا کونوینٹ میں اور چاندنی کا کارپوریشن کے سرکاری اسکول میں۔ صنوبر کے تین بچے ہوگئے۔ دونوں میاں بیوی بہت خوش تھے کہ خدا نے ان کے خاندان کو مکمل کر دیا۔ اب بچے اچھے نکل جائیں اور تعلیم مکمل ہو جائے تو خدا کا شکر ادا کریں۔ گھر میں چاندنی اور نغمہ مولوی صاحب سے کلام پاک بھی پڑھنے لگیں۔

نغمہ کی طرح چاندنی بھی اسحاق صاحب اور سنوبر کو ممی پاپا کہنے لگی۔ نغمہ کے ساتھ چاندنی بھی اسحاق صاحب کی گود میں اکثر پہنچ جاتی اور وہ اسے خوب پیار کرتے۔ تھی بھی وہ بہت پیاری۔ گو نغمہ کا اترن پہنتی لیکن وہ نغمہ سے زیادہ خوب صورت، گوری اور تیز تھی۔ گو صنوبر نغمہ کو طرح طرح کے ٹانک، پھل میوے، بسکٹ کھلاتی لیکن اس کے جسم کو لگتا ہی نہیں اور وہ کمزور اور سانولی سی لگتی۔

وقت تیزی سے گزرنے لگا نغمہ اور چاندنی اونچے درجوں میں پہنچ گئیں۔ وقت کے ساتھ چاندنی اور بھی خوب صورت ہوتی جارہی تھی۔ اسحاق صاحب بارہ تیرہ سال کی عمر سے چاندنی کی تعریف کرتے۔ صنوبر کو ان کی نگاہ اچھی نہیں لگتی۔ ایک دن تو آرزو بوا نے آ کر خبر کیا کہ اکثر صاحب آفس سے آ کر سیدھے ان کی کوٹھری میں جاتے ہیں جہاں چاندنی پڑھتی رہتی ہے اور وہ اس کے لئے تحفے بھی لا کر دیتے ہیں۔ آرزو بوا نے اسحاق صاحب کی اس حرکت کی مخالفت کی اور صنوبر بی بی کو کہہ دیا کہ وہ اپنے شوہر کو اس حرکت کے لئے منع کریں وہ غریب ہیں ان کی بدنامی ہوگی دوسرے لوگ دیکھ لیں تو کیا کہیں گے۔ صنوبر بی بی کے دل میں فضول بات نہیں تھی لیکن پھر بھی انہوں نے اپنے شوہر کو منع کیا لیکن ان کی حرکت میں کوئی کمی نہیں ہوئی تو صنوبر بی بی نے شوہر کی مخالفت کی اور خود انہوں نے محسوس کیا کہ آفس سے آنے کے بعد آدھے گھنٹے تک وہ کہاں رہتے ہیں اور آدھے گھنٹے کے بعد وہ گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ صنوبر بی بی نے اسحاق صاحب کے آنے کے وقت پورٹیکو میں کھڑے رہنے کا طے کیا جس سے اسحاق صاحب کا چاندنی کے کمرے میں جانا بند تو ہو گیا لیکن دوسری طرف اسحاق صاحب صبح کو گھومنے کا بہانہ بنا کر کوٹھی سے نکل جاتے اور پھر وہ چاندنی کے کمرے میں پہنچ جاتے جہاں وہ اسکول جانے کی تیاری میں لگی رہتی تھی۔ اسحاق صاحب یہ سب خاموشی سے کرتے کہ کسی کو پتہ نہ لگے۔

جب سنوبر نے اسحاق صاحب کو اُن کی حرکت لے لئے روک ٹوک کی تو انہوں نے جواب دیا تم چاندنی سے جلتی کیوں ہو وہ خوب صورت ہے جوان ہے ظاہر ہے مجھے بہت اچھی لگتی ہے مجھے اس سے عشق ہو گیا ہے وہ اٹھارہ سال کی ہو گئی ہے اب میں اس سے نکاح کرسکتا ہوں۔ شروع میں تو صنوبر نے مذاق سمجھا اور بات کو مذاق میں اڑا دیا۔ لیکن چاندنی کے لئے چکر کاٹنا صنوبر کو بالکل اچھا نہیں لگتا اور ایک دن صنوبر نے اسحاق صاحب کو خوب کھری کھری سنائی لیکن اسحاق صاحب نے بہت مستقل مزاجی سے چاندنی سے نکاح کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ صنوبر کو ایسا لگا کوئی اسے گندی گندی گالیاں دے رہا ہو کوئی اس کے منہ پر تھوک رہا ہے۔

اسحاق صاحب نے صنوبر سے کہا کہ اپنے کمرے کو چھوڑ دو اور دوسرے کمرے میں شفٹ کر جاو یہ کمرا ہمارے اور چاندنی کے لئے رہے گا۔ صنوبر نے تینوں بچوں کی مدد سے اپنا سامان دوسرے کمرے میں لے کر چلی گئی نغمہ اس کے ساتھ رہی۔ ایک دن تو صنوبر نے آرزو کو کہا کہ تم چاندنی کو لے کر کہیں اور چلی جاؤ لیکن اسحاق صاحب سن کر سخت ناراض ہو گئے اور بولنے لگے کے کوٹھی ہماری ہے خرچ میں چلاتا ہوں تو آپ کا کوئی حق ان لوگوں کو ہٹانے کا نہیں ہے۔ صنوبر اس منحوس گھڑی کو کوستی جب اس نے آرزو بوا کو اپنے گھر میں جگہ دی تھی حالانکہ آرزو بوا نے بھی کوئی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا وہ اسحاق صاحب کی مخالفت بہت کرتی رہیں۔ صنوبر سوچتی جب ان کا شوہر ہی بے ہودہ ہے تو دوسروں کو کیا الزام دیا جائے ان کی قسمت ہی خراب تھی جو ایسے خراب آدمی کے ساتھ ان کی زندگی گزر رہی ہے۔

پھر ہوا وہی جو اسحاق صاب چاہتے تھے اور چاندنی سے اسحاق صاحب کے عقد کی تیاریاں ہو گئیں۔ چاندنی بھی اس کے لئے تیار تھی تعجب کی بات تو یہ تھی آرزہ بوا نے چاندنی کو ہر طرح سمجھانے کی کوشش کی یہاں تک کی اُس کی پٹائی بھی کر دی لیکن

چاندنی نے ایک نہ سنی۔ محلے کے مولانا صاحب چند لوگوں کے ساتھ آئے اور اسحاق صاحب کا عقد چاندنی کے ساتھ پڑھا دیا۔ چاندنی نوکروں کے کمرے سے اسحاق صاحب کے بیڈروم میں آ گئی۔ سرخ جوڑے میں اور بھی خوب صورت لگ رہی تھی۔ اسحاق صاحب تو اپنی کامیابی پر نہایت خوش شیروانی اور ٹوپی میں خضاب لگا کر جوان بننے کی پوری پوری کوشش کر رہے تھے۔ اس دن سے اسحاق صاحب آفس سے آ کر اپنے بڈروم میں آتے اور جاتے وقت نکلتے۔ صنوبر بھی اپنے کمرے میں پڑی پڑی خاموشی سے سوچتی، میں آنکھو سے آنسو تو نہیں نکلتے لیکن ان کی خاموش سسکیاں ان کے بچوں کو سنائی دیتی۔ کھانہ، ناشتہ، چاے اسحاق صاحب اور چاندنی کا ان کے بڈروم میں جاتا۔ کچھ دن اس طرح گزر گئے اسحاق صاحب اور چاندنی کا کھانا ناشتہ نوکران کے بیڈروم میں لے جاتا لیکن آرزو بوا نے ایک دن بھی اپنی بیٹی کی سودھ نہیں لی وہ سخت ناراض تھیں اور بد دعائیں دیتی رہتی تھیں۔ وہ سخت شرمندہ تھیں کہ جس نے بُرے وقت میں سہارا دیا انہیں ہی اتنا بڑا دھوکہ دیا گیا اور ہنستے کھیلتے گھر میں افسردگی چھا گئی۔

اسحاق صاحب کے بڑے بیٹے کو یہ سب دیکھ کر رہا نہیں گیا اور اس نے ایک دن جب اسحاق صاحب آفس جانے کو تیار تھے پوچھ لیا۔ اس نے کہا، ”ہم لوگوں سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہوگا اپنی امّی کی یہ خاموش سسکیاں ہم لوگوں سے برداشت نہیں ہو رہی ہیں وہ ایک کمرے میں قید ہو کر رہ گئی ہیں اور وہ بھی دائی کی معمولی لڑکی کے لئے“۔

اسحاق صاحب نے عروج کو ڈانٹ دیا، ”چاندنی اب گھر کی دائی نہیں وہ تمہاری ماں ہے عزت سے نام لو“۔

عروج رونے لگا۔ اسحاق صاحب نے پھر کہا، ”تم لوگ یہاں نہیں رہو گے

تو میں اس کا بھی انتظام کر دوں گا۔ تم اپنی امّی سے کہہ دو کہ کسی مقدمے کے چکّر میں نہ پڑیں گی ان کے پاس نہ پیسے ہیں اور نہ صلاحیت۔ ہاں چند دنوں میں تم لوگوں کے لئے انتظام ضرور کر دوں گا اگر تم لوگ یہاں رہنا نہیں چاہتے ہو"۔

چند دنوں کے بعد اسحاق صاحب نے عروج اور عارف کو نوکر سے اپنے پاس بلایا اور اکیس ہزار کا چک صنوبر کے دین مہر کی، دو لاکھ کا چک نغمہ کی شادی کے لئے اور پانچ لاکھ کا چک دیا کہ اس کے انٹریسٹ سے گھر کا خرچ اور تم لوگوں کی پڑھائی کا خرچ چلے گا۔ ساتھ ایک فلیٹ کی چابی بھی۔

دوسرے دن ہی صنوبر بھی اپنے تینوں بچوں کے ساتھ نئے چھوٹے سے فلیٹ میں آ گئیں۔ آرزو بوا بھی ساتھ آ گئیں۔ صنوبر کا دل رو رہا تھا لیکن پھر بھی یہاں گھٹن محسوس نہیں ہو رہی تھیں۔ صنوبر کو تو اسحاق صاحب کی شکل دیکھنے کی خواہش نہیں ہو رہی تھی اور وہ خاموشی سے اس فلیٹ میں اپنے سامانوں کے ساتھ آ گئیں۔ صنوبر بھی سوچتی کہ اگر اسحاق صاحب کو دوسرے نکاح کی خواہش تھی تو وہ نکاح کرتے لیکن جس بچی کو انہوں نے گود میں لیا، اسے بیٹی کہا، اس بچی سے ان کا دل نکاح کے لئے تیار ہو گیا نہات تعجب کی بات ہے۔ اسحاق صاحب کی عمر قریب قریب پچاس سال اور چاندنی کی عمر اٹھارہ سال ہو رہی تھی۔ اس عمر میں انہوں نے اپنا شوق پورا کر لیا تھا۔

صنوبر ہی کے نئے فلیٹ میں جانے کی خبر سے ہی ان کے سسرال والے آنے لگے جن لوگوں نے اسحاق صاحب کے بنگلے پر آنا چھوڑ دیا تھا وہ سب رشتہ داروں کے آنے جانے کا سلسلہ شروع ہو گیا سب صنوبر ہی کی ہمدرد اور مددگار تھے۔ ان لوگوں نے نغمہ کا ایک اچھا رشتہ بھی طے کر دیا۔ اسحاق صاحب کو خبر کر دیا گو ان کو کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی ۔رشتہ داروں اور دونوں بیٹوں کی مدد سے صنوبر بی نے اس فرض کو انجام دیا اور شادی کی پوری تیاری ہو گئی۔ نغمہ کی شادی ایک اچھے خاندان کے تعلیم یافتہ لڑکے سے ہو گئی۔

شادی کا کارڈ اسحاق صاحب کو بھی بھیجا گیا لیکن وہ تھوڑی دیر کے لئے آئے لیکن صبح رخصتی کے وقت نغمہ کی آنکھیں اپنے پاپا کو تلاش رہی تھیں جو وہاں موجود نہیں تھے۔ شادی کے بعد نغمہ اپنے شوہر کے گھر ہنسی خوشی رخصت ہوئی اور خوش تھی۔ اس طرح چھ سال گزر گئے۔

ایک دن صنوبر بی اپنے بیٹوں عروج اور عارف کے ساتھ کہیں جا رہی تھی۔ وہ رکشے پر تھی اور اسحاق صاحب اپنے تین عدد چھوٹے بچوں کے ساتھ اچھی شاندار گاڑی پر اپنی خوب صورت بیوی کو لے کر جا رہے تھے۔ صنوبر بی کے دل سے آہ نکل گئی ۔صنوبر کے دونوں بیٹے ماں کی بہت عزت کرتے تھے۔ دونوں نے ماں کو سمجھایا ''امی صبر کریں ہم لوگ جلد ہی سروِس میں لگ جائیں گے اور آپ کی ہر تنہائیاں بھی انشاءاللہ دور ہو جائیگی لیکن پاپا ان چھوٹے چھوٹے بچوں کی خوشیاں دیکھنے کے لائق نہیں رہیں گے نہ ہم لوگوں کی خوشی دیکھ سکے اور نہ ان بچوں کی خوشی دیکھ سکیں گے جب تک وہ بڑے ہوں گے پاپا کی عمر کافی ہو چکی ہوگی۔ ابھی اُن کی عمر پچپن سال ہو چلی ہے''۔ چاندنی جس نے شان وشوکت کوٹھی اور گاڑی کی لالچ میں آپ کو رلایا ہے باقی زندگی رو رو کر گزارے گی آپ اطمنان رکھیں۔ امی آپ کی خاموش سسکیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔ خدا اس کا بدلہ انشاءاللہ ضرور ضرور لے گا۔''

آرزو بوا نے صنوبر اور بچوں کو بہت پیار دیا اور عمر بھر ان کے ساتھ رہ گئیں۔ صنوبر بی سوچتیں پچیس ۲۵ ر سالوں کا رشتہ ایک جھٹکے میں ٹوٹ گیا کیا دین مہر ہی ڈور تھی جس نے اسحاق صاحب سے باندھ کر رکھا تھا اور کوئی پیار ہمدردی نہیں۔ صنوبر نے کہا اسحاق صاحب دس شادیاں کرتے مجھے افسوس نہیں ہوتا لیکن گھر کی چھوکری کے سامنے مجھے بے عزت کیا اسے میں زندگی بھر معاف نہیں کروں گی۔

ماضی کے جھروکے سے

اللہ قسم خدا قسم میری قسم بڑی بوبو آگے مت پڑھوگی ہم باورچن کو سبزی کے بارے میں بتا کر فوراً آرہے ہیں۔ بڑی بوبو نے ناول میں نشان لگا کر بند کر دیا۔

منجھلی بہن (احمدی) جو پاس بیٹھی تھی بولے لگیں بڑی بوبو ''کیا ہم تمہاری کتاب سننے آئے ہیں۔ تم دونوں بہنیں تو کتاب میں ڈوبی رہتی ہو اور ہم منہ دیکھتے رہتے ہیں۔ یہاں رہنے کا تو کوئی فائدہ نہیں دو چار دنوں میں ہم بہار شریف چلے جائیں گے''۔

بڑی بوبو نے کہا ''کیا کریں احمدی جب کوئی کتاب شروع ہو جاتی ہے اور اس میں دلچسپی ہو جاتی ہے تو چھوڑنے کا دل نہیں کرتا ہے۔ تم سنو احمدی بڑا مزہ آئے گا''۔

''ہاں ہاں خوب پڑھو بچپن سے تم تیز تھیں جلدی جلدی پڑھنا بھی آ گیا نکاح بھی تمہارا نو سال کی عمر میں ہوا ہمارا سات سال میں اس لئے پڑھنے کا موقع بھی نہیں ملا''۔ منجھلی بہن احمدی نے جواب دیا۔

چھوٹی بہن انوری بیگم بھی وہاں موجود تھیں ٹوکا لگایا ''منجھلی بوبو کو تو بچپن سے شرارت میں دل لگتا تھا ایک ایک شرارت یاد ہے استانی اور اماں سے پٹاتی بھی تھیں''۔

کٹونے والی دادی جوان تینوں بہنوں کی خالہ تھیں بولنے لگیں ''جب سلما اور احمدی کا نکاح ہوا تھا تو دونوں بہنیں ایک ہی کمرے میں تھیں احمدی نے سلما کی نتھ نوچ دی تھی جس سے سلما کی ناک سے خون نکلنے لگا تھا''۔

جمال الدین چک والی دادی نے کہا ''اس کا مطلب ہے احمدی بہت شریر تھیں''۔

احمدی دادی نے کہا بڑی بو بو کی نتھ ہم سے بڑی اور خوب صورت تھی اور وہ بار بار اپنی نتھ کو لہرا رہی تھیں۔ دکھا رہی تھیں تو ہم کو غصہ آ گیا اور ہم نے کھینچ دیا تو خون نکل گیا۔ مار بھی تو مجھے اماں سے پڑی"۔

کٹو نے والی دادی نے کہا کہ دونوں بہنوں کے بیچ ایک پردہ ڈال دیا گیا لیکن احمدی پردہ اٹھا اٹھا کر لڑ رہی تھیں پھر دونوں بہنوں کو دو کمروں میں کیا گیا۔"

جانتی ہو دلہن کٹو نے والی دادی نے جمال الدین چک والی دادی سے کہا جانتی ہو دلہن۔ جب احمدی کے سسرال سے لوگ تاریخ طے کرنے آئے تو گیت گانے والی بوا لوگوں میں احمدی سب سے آگے گالی گانے کو چلی گئیں اس دن بھی ان کی پٹائی ہوئی"۔

مجھے ان لوگوں کی نوک جھونک میں بڑا مزا آتا تھا گو مجھے وہاں سے بھگا دیا جاتا اور کبھی کبھی تو پرانی استانی جی سے مجھے زبردست تھپڑ بھی پڑ جاتی تھی۔

میری دادی اماں (سلما خاتون) اپنے بچپن کی بہت ساری باتیں بتاتی رہتی تیں۔ کہتیں تھیں احمدی بچپن سے بہت چنچل اور شریر تھیں۔ ایک روز ابا نے کہا تینوں لڑ کیاں اپنے شوق سے کچھ پکا کر لائیں گی تو انعام ملے گا۔ میری عمر اس وقت دس سال تھی ہم نے آلو کی مزیدار سبزی بوا سے پوچھ کر بنایا۔ احمدی دن بھر کھیل کود میں لگی رہیں لیکن جب ابا کا کچہری سے آنے کا وقت ہوا تو میری بنائی ہوئی آلو کی سبزی کو سل پر پیس کر دال بنا دیا اس دن بھی ابا نے ان کو خوب ڈانٹا تھا۔ انوری جو صرف سات سال کی تھیں بوا کی مدد سے املیٹ بنا کر لائیں۔ مجھے اور انوری کو ایک ایک روپیہ انعام ملا لیکن احمدی کو خوب ڈانت پڑی"۔

"ہاں ہاں بڑی بو بو تم دونوں بہنوں کی تو خوب تعریف ہوتی تھی ماموں، خالہ، سب تم کو پیار کرتے تھے میں تو ہمیشہ ڈانٹ کھاتی رہتی"۔ احمدی دادی نے یہ بتا کر کہا:

''دیکھو احمدی شرارت بھی تم ایسی ایسی کرتی تھیں اگر میں نوشے بھائی سے (میری دادی امّاں کے ابّا) سے بچاتی تھی ورنہ تمہیں تو روزانہ ڈانٹ پڑتی۔ کس طرح سے تم نے سلما کی مرغی کے بچوں کو بے دردی سے مار دیا تھا''

''ہاں خالہ مارا تھا بڑی بوبو کی مرغی کے سولہ بچے نکل گئے لیکن میری مرغی کے سب انڈے خراب ہو گئے ہمیں غصہ آیا اور بڑی بوبو کی مرغی کے بچوں کو پلنگ کے پائے سے دبا کر مار دیا''۔

تم روز اپنی مرغی کے انڈوں کو نکال نکال کھودتی رہتی تھیں اس لئے بچے مر گئے تم بھور میں بچے کو مارنے کے وقت پکڑی گئیں اور پھر اپنی اماں سے مار بھی تو کھایا تھا۔''

''ہاں بھائی بڑی بوبو دیکھنے میں اچھی پڑھنے میں سلیقے میں اچھی تھیں اس لئے ہمیں ڈانٹ مار پڑتی تھی۔ خیر تو یہ سب بچپن کی باتیں ہوئی اب تو دونوں بہنیں ہمیں بہت پیاری ہیں ایک بڑی اور ایک چھوٹی لیکن بڑی بوبو کی ایک ہی بات سے ہمیں شکایت ہوتی ہے ان کی موٹی موٹی کتابیں پڑھنا۔ ہم تو دوڑ دوڑ کر پٹنہ آتے ہیں اور یہاں بڑی بوبو کتابوں میں کھوئی رہتی ہیں۔ دادی جان نے جواب دیا۔

اب میں تمہاری موجودگی میں کوئی ناول نہیں پڑھوں گی سوائے اخبار کے کیونکہ اخبار کے بغیر تو ہم کو سکون نہیں ملتا ہے۔

اکثر کتونے والی دادی بہار شریف والی دادی بچپن والی دادی ہماری دادی اماں رہتیں تو خوب مزا آتا ان لوگوں کی آپس کی باتیں۔ طرح طرح کا کھانا بنتا اور خوب خوب دعوتیں ہوتیں۔

کبھی تو قلفی ملائی برف والے کو بلا کر سب لوگ خوب کھاتے ہمارے محلے میں دو بھائی راما اور جستہ دونوں بہترین قلفی بناتے اور مٹی کے گھڑے میں خوب سجا کر

بیچتے۔ میں تو بچپن سے راما دادا اور جستہ دادا کہتی تھی۔ چاہے کسی ذات یا کسی پیشے کے لوگ تھے بزرگ کو دادا اُن سے جوان کو چاچا اور چھوٹی عمر کو بھیا کہنا مجھے سکھایا گیا تھا۔ عید میں لوگ ہم لوگوں سے ملنے آتے جوان لوگ تو کھاتے مگر بزرگوں کے سیدھا جاتا یعنی باسمتی۔ سبزی۔ مصالحہ اور کچھ پیسے۔

محلے میں زیادہ لوگ کائستھ تھے۔ رامیشور چاچا جن کی ماں بنارس کی تھیں جب بنارس جاتیں ہمارے لئے گُڑیے کے کپڑے زیور لاتیں۔ اس لئے میں ان کے بنارس جانے اور آنے کی شدت سے انتظار کرتی۔

جب ہماری دادیاں آتیں تو محلے کی سب عورتیں ان لوگ سے ملنے ضرور آتیں اور بہت عزت واحترام سے ملتیں۔ بھگو چاچا منو چاچا جن کی کرانہ کی دوکان تھی۔ رامیشور چاچا جو کہیں سروس کرتے تھے ان کا بیٹا گوپال ہماری عمر کا تھا اور ہم ساتھ کھیلتے تھے ایک دن آ کر کہنے لگا ہماری بوڑھی دادی (پردادی) مر گئیں۔ خوب باجا بجے گا ارتھی کے ساتھ خوب مزا آئے گا۔ دسویں اور تیرھویں میں کھانہ بھی خوب بنے گا۔

تصویر والے دادا جن کو سب لوگ تصویر والے کہتے تھے آرٹ کالج میں ٹیچر تھے لیکن چونکہ مصوری کرتے تو بچارے تصویر والے کہلانے لگے تھے۔ ان کو انگریزوں کے وقت مصوری کے لئے انعام بھی ملا تھا لیکن وہ مرتے وقت تک تصویر والے رہے۔ جمنا دادا جن کی اردو کی صلاحیت اتنی اچھی تھی کہ میرے والد صاحب کو اُنہوں نے اردو پڑھایا تھا۔ جمنا دادا کے ہاتھ میں ہر وقت ناس کی شیشی رہتی اور وہ اسے سونگھتے رہتے تھے یہ ان کی عادت تھی۔ پڑھائی لکھائی کے سلسلے میں جمنا دادا کے مشورے کی بہت اہمیت تھی۔ دادا ابا سے لے کر سب چھوٹے بڑے اُن کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ماسٹر جمنا دادا کے مشورے سے میرے لئے دو ٹیچر رکھے گئے۔ سبحان صاحب جو اردو اور کلام پاک پڑھاتے صبح کو آتے تھے اور اُن کے بیٹا رحمان صاحب

انگریزی اور حساب کے لئے رکھے گئے جو شام میں آتے تھے۔ دونوں باپ بیٹے ایک دوسرے کی نکتہ چینی کرتے تھے۔ سبحان صاحب کہتے ''میں رحمان نہیں ہوں جو چھوڑ دوں گا چھڑی سے ٹپای کروں گا'' اور رحمان صاحب کہتے ''میں ابا نہیں ہوں جو صرف ڈانٹ کر چھوڑ دوں گا اٹھا بیٹھی کرائے بغیر معاف نہیں کروں گا۔ نتیجہ دو چکّی میں میں پس رہی تھی۔

میری دادی جاں مجھے چاند کہتی تھیں اگر چاند کو خبر ہو جاتی تو شرمندگی سے ڈوب جاتا۔ عید کے موقع پر تو مجھے سب دادیوں کا مرکز بننا پڑتا کوئی چھاپی ساری پہنا دیتیں، کوئی چاند ماتھے پر لگا دیتیں اور کوئی ٹکلی لگاتیں۔ کوئی مہندی لگواتیں۔ میں دیوالی کی گڑیا بن جاتی آئینے کے سامنے تو میں خود اپنے کو پہچان نہیں پاتی شکل ایسی ہو جاتی۔

ستوانی کا میلہ لگتا تو کیلاش پٹواری دادا میرے لئے مٹی کے برتن خرید کر لاتے۔ چھوٹی چھوٹی مٹی کی پتیلی ہر رنگ کی پالش کی ہوئی جو مجھے بہت زیادہ پسند ہوتی۔

میں ان سب کو یاد کرتی جو ہماری زندگی میں میرے نزدیک رہے جن سے مجھے پیار ملا، خلوص ملا۔ پانچ عدد دادیوں کی یاد، ان لوگوں کی نوک جھونک، ان لگوں کے دلار نے میری زندگی میں بہت اثر کیا اور آج بھی قائم ہے۔

اس وقت نہ کوئی ذات اور مذہب کا فرق مجھے معلوم تھا اور نہ ہم لوگوں کے درمیان ان سب باتوں کا ذکر ہوتا تھا۔ سب کی زباں میں مٹھاس اور سب کے دلوں میں پیار تھا چاہے وہ کسی ذات یا مذہب کے ہوں۔

یہ سب باتیں ہو رہی تھیں کہ سعید دادا جمال الدین چک سے آ گئے جن کو میں بڑے دادا کہتی تھی آ گئے۔ ان کی پُر مذاق شخصیت سب کو بہت پسند تھی۔ مجھے وہ پیاری پوتی کہتے۔ سب کی محفل جم گئی اور وہ بھی طرح طرح کی باتیں کرتے رہتے اور سب کو

خوب ہنساتے۔

آج جب کہ میں خود دادی و نانی بن چکی ہوں مجھے اپنی دادی نانی کی یاد شدت سے آتی ہے۔ آج کی مصروف زندگی میں خدا معلوم بیچارے نواسے۔ لواسی، پوتے۔ پوتی ہم لوگوں کو یاد کریں گے یا نہیں۔ کاش سب ماضی کے جھروکے میں جھانک کر اپنے بزرگوں کی مغفرت کی دعائیں تو کریں گے۔

اللہ سب دادیوں کو جنت الفردوس میں جگہ دے (آمین) جنہوں نے مجھے بہت پیار دیا۔ موٹے ناول یا موٹی کتاب دیکھتی ہوں تو منجھلی دادی کی یاد آجاتی ہے جن کو موٹی کتابوں سے سخت چڑھ تھی اور بیچاری دادی جان کو سخت الفت تھی۔

عجت دار باراتی

ہمارے محلے کے دھوبی پیارے محمد کے بیٹے کی شادی تھی۔ پیارے محمد جسے سب لوگ صرف پیارے کہتے ہیں۔ ہم لوگوں کا خاندانی دھوبی ہے اس کے پردادا ہمارے پردادا اس کا دادا ہمارے دادا اور اس کا باپ ہمارے ابا جان کے کپڑے دھونے کا کام کرتا رہا۔ کپڑے دھونے استری کرنے سب کام میں پیارے بہت ماہر ہے اور جلدی کا کام ہے تو اور بھی تیزی دکھاتا ہے۔ پیارے ہم لوگوں کا خاندانی دھوبی رہنے کی وجہ کر ہم لوگوں کے خاندان کا فرد جیسا ہو گیا تھا۔ محلے میں پیارے کی بہت عزت ہے۔ وہ ایک شریف انسان ہے۔ کسی طرح کا نشہ نہیں کرتا ہے۔ حد تو یہ ہو گئی کہ وہ بیڑی سگریٹ کو بھی ہاتھ نہیں لگاتا۔ ہندو مسلمان سب کے یہاں وہ عزت کی نظر سے دیکھا جاتا اور وہ خود بھی دوسروں کی عزت کرتا بلکہ ہر کی مدد کے لئے تیار ہو جاتا۔ کسی کو کوئی پریشانی ہوتی تو پیارے اس کی مدد کے لئے ہر ممکن کوشش کرتا۔ ہمارے یہاں تو اور بھی خیال ہوتا کیونکہ کپڑے دھونے کے علاوہ بھی پیارے سے امی

دوسرے کام لیا کرتیں۔ پیارے آتا تو ہماری امی دوسرے کام کروالیتیں۔ مچان سے سامان اتارنا یا رکھنا ہے وہ پیارے کردیتا۔ اکثر بازار سے سامان بھی منگا لیتیں۔ پیارے کے گھر کی عورتیں بھی ہمارے یہاں آکر گھر کے کاموں میں ہماری امی کی مدد کردیتیں۔

پیارے کے صرف دو بیٹے ہیں۔ ایک دن پیارے بہت خوشی خوشی مٹھائی کا ڈبہ ہاتھ میں لے کر آیا اور کہنے لگا ''ہمارے بیٹے شرفو کی شادی طے ہوگئی ہے۔ پیارے بہت خوش تھا اس نے تفصیل بتائی، لڑکی دیکھنے میں بہت اچھی ہے نیک ہے اور کلام پاک پڑھ چکی ہے۔ باپ لڑکی کے ریلوے میں چوتھے درجے کا ملازم ہے سرکاری کواٹر ملا ہوا ہے۔ ہم لوگوں کی خوب خاطر ہوئی۔ بازار کا شربت، کولڈ ڈرنک ملا اور اس کے علاوہ ناشتہ اور کھانا بھی بہت اچھا ملا۔ آتے وقت ہم لوگوں کو اکاون روپیہ رخصتانہ بھی ملا۔ ہم نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ سوئے ٹولیس، مٹھائی، پھل اور لڑکی کا کپڑا بھی لے کر گئے تھے۔ ہم سب لوگوں نے پیارے کو مبارکباد دیا اور اچھے سے شادی ہونے کی دُعا بھی دی۔

مختصر یہ کہ پیارے بہت خوش تھا۔ ۱۰ مارچ کی تاریخ طے ہوگئی، شادی کی۔ بھیا لوگوں کو تو بارات میں جانا ہوگا پیارے اس بات پر بار بار زور دے رہا تھا۔ پیارے کا بار بار یہ کہنا کہ

''آخر کچھ تو پڑھے لکھے اور اچھے لوگ بارات میں رہینگے تو بارات کی رونق ہو جائیگی۔ ہمارے سمدھی ریل میں کام کرتے ہیں اس نے کہا ہے کہ جتنے باراتی آئیں۔ کرایہ نہیں لگے گا۔ ہمارا نام لے کر آجائینگے صاحب لوگوں سے کہہ دیا گیا ہے۔ ٹکٹ کسی کی نہیں لگے گی۔

اس اعلان کے بعد بہت لوگ بارات میں جانے کو تیار ہوگئے۔ مفت میں آنا

جانا، گھومنا اور اس پر کھانا پینا۔ دھوبی برادری کے تو کافی لوگ تیار ہو گئے۔ پیارے کے بار بار کہنے اور عزت بڑھانے کے لئے ہم لوگ دونوں بھائی بھی تیار ہو گئے۔ ساتھ ہی ذکی چچا کے دولڑکے بھی بارات میں جانے کے لئے تیار ہوئے۔

۱۰ر مارچ کو ہم لوگوں کا قافلہ اسٹیشن کے لئے روانہ ہوا۔ اسٹیشن تو نزدیک ہے اس لئے سب پیدل تھے دولہا اور ہم لوگوں کے لئے تین رکشے پیارے نے بلائے۔ خسرو پور اسٹیشن پر گاڑی تھوڑی دیر رکتی ہے اس لئے افراتفری مچ گئی جو ڈبہ سامنے ملا لوگ اس پر بیٹھتے رہے۔ اس بھیڑ بھاڑ میں سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کون کہاں بیٹھا۔ دولہا میاں اپنے ابا کے پاس اپنے دوستوں کو لے کر بیٹھ گئے۔ ایک گھنٹے میں گاڑی پیارے کے سمدھیانے والے اسٹیشن پر پہنچ گئی۔ گاڑی تھوڑی دیر ہی ٹھہرتی ہے۔ بارات کو لینے دو چار لوگ بھی آئے تھے۔ اسٹیشن پر چیخ پکار تھی کوئی کسی کو پکار رہا ہے کوئی کسی کو کھوج رہا ہے۔ آخر گاڑی کھلنے لگی تو چیخ کر سب کو جمع کیا گیا اور پھر بارات یہاں سے روانہ ہوئی اس اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں بارات کے رکنے کا انتظام تھا لہذا ہم لوگ اتر کر سیدھے ویٹنگ روم میں آگئے یہاں فرش لگا۔ دولہا بابو سہرے مکنے کے ساتھ منہ پر رومال رکھے شرمائے شرمائے سے گود میں اٹھا کر لائے گئے۔ پلیٹ فارم پر ایک تماشہ سا ہو گیا۔

ہم لوگوں نے نہانے کی خواہش ظاہر کی تو پیارے کے سمدھی نے ویٹنگ روم کے باتھ روم کے بارے میں بتایا۔ باقی باراتیوں کو پکھرا پر جا کر نہانے کے لئے کہا گیا تھا۔ اس گرمی میں سب لوگ نہانے کا خواہش مند تھا۔ نہانے کے بعد ہم لوگوں کو ویٹنگ روم میں کولڈ ڈرنک ملا اور لوگوں کو پلیٹ فارم پر ہی شربت دیا گیا۔ پیارے نے ہم لوگوں کا تعارف اپنے سمدھی سے کچھ اس طرح کرایا۔ بابو لوگ ہیں خوب پڑھے لکھے ہیں اور سید ہیں۔ ہم سب بڑے بڑے لوگوں کو گھر کے کپڑے دھوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ہم نے دھیرے سے پیارے کو کہا تم بار بار ہم لوگوں کا ذکر مت کرو۔ تمہارے رشتہ داروں کو برا لگے گا لیکن پیارے کو ان سب باتوں کی کوئی فکر تو تھی نہیں وہ اپنی اہمیت جتانے میں پیچھے رہنا نہیں چاہتا تھا۔ ہم لوگوں کو نقلی گلاب میں عطر لگا کر دیا گیا۔

اپنے سمدھیانے کے لوگوں سے ہم لوگوں کا تعارف کرا رہا تھا۔ یہ ہیں چھوٹے بھیا اور یہ اس کے بڑے بھیا اور یہ دونوں ہیں (ذکی چا کے لڑکوں کی طرف اشارہ کرکے) بتایا یہ ہیں سونو بھیا اور یہ ہیں مونو بھیا سب بہت پڑھے لکھے ہیں اور سید بھی ہیں۔ پیارے کے سمدھی اختر نے بھی ہم لوگوں کی خاطر میں کوئی کمی نہیں کی۔ ہم لوگوں کے لئے ویٹنگ روم میں ہی فرش پر دستر خوان لگا کر ناشتے لگانے لگے اور لوگوں کو ڈبوں میں پلیٹ فارم پر ہی ناشتہ مل گیا۔ ویٹنگ روم دوسرے درجے کے مسافروں کے لئے تھا۔ مسافر بیچارے پلیٹ فارم پر پڑے تھے۔ ویٹنگ روم میں ہم لوگوں نے تین گھنٹے گذارے اور پھر پانچ بجے شام میں بارات کی روانگی کا وقت آ گیا۔ باجے گاجے کے ساتھ بارات تیار ہوگئی۔ دولہا بابو بھی بن ٹھن کر تیار ہو گئے۔ دولہا کے لئے گھوڑی آئی تھی جسے دیکھ کر ہم سب کو اس کے حال پر افسوس لگ رہا تھا۔ بیچاری کمزور سی گھوڑی اس پر لمبا چوڑا دولہا چڑھ رہا تھا۔ گھوڑی بار بار ہمت ہار جاتی اور دولہا کو پٹکنے کو تیار ہو جاتی لیکن لوگ اسے سنبھال لیتے۔ اس طرح بارات روانہ ہوئی۔ پیارے کے سمدھی کا کوارٹر پاس میں ہی تھا۔ ورنہ دور ہوتا تو شاید گھوڑی دولہا کو دروازے لگانے سے پہلے دنیا چھوڑ دیتی۔ لوگ ناچتے گاتے ہنگامہ مچاتے لڑکی والوں کے یہاں پہنچ گئے۔ گیت کی زبردست آواز تھی۔ یہاں بھی پیارے نے ہم لوگوں کا تعارف اس طرح کرایا۔ ''یہ'' ہیں بابو لوگ بہت پڑھے لکھے ہیں اور سید ہیں''۔ مجھے پیارے کے اس جملے سے چڑھ ہونے لگی تھی لیکن مجبوری میں سننا پڑ رہا تھا اگر گھر پر یہ

جملے سنتا تو ڈانٹ بھی دیتا لیکن سمدھیانے میں خاموش رہنا پڑا۔ہم چاروں بھائیوں کو بارات میں آگے رکھا گیا۔لڑکی والوں کے یہاں بھی ہم لوگوں کے لئے کرسیاں آئیں۔نکاح کے وقت ہم چاروں بھائیوں کو دولہا کے پاس چوکی پر بیٹھایا گیا۔یہاں بھی ہم لوگوں کے لئے کولڈ ڈرنک آئی اور لوگوں کو گلاس میں شربت ملا۔ہار بھی ہم لوگوں کو اچھا ملا دوسروں کو معمولی۔میں نے پیارے سے کہا،تمہارے کچھ بزرگ رشتہ دار بھی آئے ہیں۔ان لوگوں کا بھی خاص خیال کرو لیکن پیارے نے میری باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ہر بات کے رائے مشورے کے لئے ہم لوگوں کے پاس آتا اور ہر بات پوچھتا۔ پیارے نے کہا۔ بابو ہمارے رستہ داروں (رشتہ داروں) کے عکل (عقل) کہاں ہے۔اس لئے آپ لوگوں سے سب بات پوچھتے ہیں۔

رات کے کھانے کا وقت ہوگیا سب لوگوں کے لئے فرش پر انتظام تھا لیکن ہم چاروں کے لئے ٹیبل کرسی کا انتظام ہوا۔ پنکھے لگائے گئے اور ایک آدمی کو ہاتھ کا پنکھا لے کر کھڑے رہنے کی تاکید بھی کی گئی جو لگاتار پنکھے جھل رہا تھا۔کھانے کے بعد ہم لوگوں کے لئے الگ کمرے میں سونے کا انتظام بھی ہوگیا۔پیارے کے سمدھی نے بتایا رخصتی صبح آٹھ بجے ہوجائیگی۔ہم لوگ تھکے ہوئے تو تھے ہی سو گئے۔صبح ہم لوگوں کے لئے چائے آگئی اور پھر وہی ناشتے کا اہتمام ہوا۔ہم لوگوں کے لئے کمرے میں ہی ناشتہ آگیا۔کافی چیز بھی تھیں۔رخصتی کا وقت ہوگیا سب باراتی تو پیدل تھے ہم لوگوں کو زبردستی رکشے پر بیٹھادیا گیا۔لڑکی کی رخصتی کے لئے ایک عدد پالکی آئی جو بہت ہی بوسیدہ حالت میں تھی اور لڑکی ماشااللہ کھائے پیئے گھر کی تندرست۔رونے دھونے کے بعد جوں ہی لڑکی کو پالکی پر بٹھایا گیا ور کہاروں نے اُٹھایا پالکی کے بانس نے جواب دیدیا اور پالکی لڑکی سمیت گرگئی۔خیر چوٹ نہیں آئی لیکن کہار کو دو چار تھپّر جڑ دیئے گئے۔پھر کسی طرح لکڑی اور اس کے سہارے پالکی کی مرمت ہوئی اور بارات

اسٹیشن کے لئے روانہ ہوئی۔ ہم چاروں کو اکاون اکاون روپیہ رخصتانہ ملا۔ اسٹیشن پر پھر وہی افراتفری ہوگئی۔ خیر کسی طرح لوگوں کو اور جہیز کا سامان چڑھایا گیا اور ہم لوگ واپس خسرو پور آ گئے۔ آتے وقت پیارے کے سمدھی نے کہا ''حضور آپ لوگ جیسے پڑھے لکھے اور سید لوگ بارات میں آئے جس کے لئے شکریہ۔ بارات کی رونق اور ہم لوگوں کی عجت (عزت) بڑھ گئی۔ اگر کوئی تکلیف ہوئی ہو تو معاف کرینگے۔ ہم لوگ ٹھیک سے خاطر نہیں کر سکیں۔ اختر ہم لوگوں کے سامنے معافی مانگ رہا تھا اور ہاتھ جوڑ کر کھڑا تھا۔ ہم لوگ خود شرمندہ ہو رہے تھے۔

ہم لوگوں نے گھر آ کر اطمینان کی سانس لیا۔ پیارے اور اس کے سمدھیانے کی یاد جب آتی ہے تو عجیب سی مسکراہٹ آجاتی ہے۔ پیارے کا یہ ''جملہ یہ لوگ پڑھے لکھے عجت دار لوگ ہیں اور سید بھی'' ہمیشہ یاد رہے گا۔

ڈراونا خواب

انوار صاحب چلاتے ہوئے اُٹھے اور شرفو بیگم کو پکارنے لگے۔ ''ذرا ایاں تو آنا'' وہ پسینے سے شرابور ہو رہے تھے شرفو بی بی نے انہیں دیکھا وہ گھبرا گئیں پوچھنے لگیں۔ تمہاری طبیعت تو خراب نہیں ہے میں ڈاکٹر کو فون کردوں، تم لیٹے رہو اُٹھنا نہیں''۔

انوار صاحب ان کے سوالوں کے بوچھار سے پریشان ہو گئے تھے اور شرفو بیگم کو سمجھانے لگے۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے بیگم میں خدا کے فضل سے بالکل ٹھیک ہوں''۔

شرفو بیگم نے ان کی بات کو ان سنی کر دیا اور انوار صاحب کو ایک گلاس پانی لا کر دیا اور فون کرنے لگیں۔ انوار صاحب نے اُٹھ کر ریسور ان کے ہاتھ سے لے لیا

اور کہنے لگے۔ بیگم میری بات تو سنو تم تو اپنی بات بکے جا رہی ہو میری بات تو سن لو۔''

شرفو بیگم ناراض ہو کر بولیں ''تم تو اپنی بیماری کو چھپاتے ہو یہ عادت تمہاری بہت پرانی ہے۔ ڈاکٹر کو بلا لیتی ہوں دیکھ لینگے۔ پورا چیک اپ ہو جائیگا۔ تمہارا چہرہ اترا ہوا ہے اور پسینے نکل رہے ہیں لگتا ہے بلڈ پریشر بڑھ گیا ہے۔''

انوار صاحب نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔''خدا کے لئے بیگم میری بات تو سنو ہم نے ایک ڈراونا خواب دیکھا ہے اور کوئی بات نہیں ہے۔''

انوار صاحب نے اپنی بیٹی کو پکار کر کہا''سجا جاؤ دیکھو ہماری لائبریری ٹھیک ٹھاک تو ہے۔''

شرفو بیگم نے کہا''لو بھلا ان کی لائبریری کو کیا ہوگا۔ سونا چاندی چھوڑ کر لوگ کتاب چرانے آئینگے۔ ان موٹی کتابوں کو کون لے جائیگا۔

انوار صاحب نے بیوی کی بات کو ٹالتے ہوئے کہا۔''سنو بیگم میں نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا ہے کہ میرا انتقال ہو گیا ہے اور لوگ میرا جنازہ لے جا رہے ہیں اس کے ساتھ میری کتابوں کا جنازہ بھی نکل رہا ہے۔ اسے بھی لوگ دفن کرتے جا رہے ہیں ہمارے بیٹے بھی ساتھ میں ہیں۔''

شرفو بیگم ناراض ہو کر بولیں توبہ توبہ کہاں صبح صبح فضول کی بات بک رہے ہو۔ کتابیں نہ ہو گئیں ہیرا موتی ہو گئیں۔ خواب میں بھی یہی ردی کاغذ آنے لگے ہیں۔''

انوار صاحب نے جواب دیا۔ خدا کے لئے ان کتابوں کو ردی کاغذ مت کہو۔ بیگم میری بہت پیاری ہیں۔ میرے پورے خواب کو تو سنو۔ ہم نے دیکھا کہ ہمارے مرنے کے بعد چند کباڑی ہماری لائبریری کے پاس آکر کھڑے ہیں اور ہماری کتابوں کو للچائی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں ان کے ہاتھ میں ترازو اور بکھرے

ہیں۔لگتا ہے ہمارے مرنے کے بعد ہمارے بچے ہماری کتابوں کو رڈی والوں کے حوالے کردینگے کیونکہ ان لوگوں کو اردو اور ادب سے کوئی دلچسپی تو ہے نہیں۔تم نے سب کو سائنس پڑھوا کر ادب سے دور کر دیا ہے۔ان لوگوں کو اردو ادب کی کتابوں سے کیا واسطہ۔تمہاری چہیتی بیٹی سیما نے دیوان غالب کو دیوانہ غالب کہا تھا۔کیا بدتمیزی ہے۔کم از کم لڑکیوں کو تو تم اردو میں ایم.اے.کروادو۔لیکن تم نے میری ایک بات نہ مانی اور سب کو سائنس پڑھوا دیا۔''

شرفو بیگم نے شوہر کو بیچ میں ہی ٹوک دیا''صبح صبح فضول کی بکواس مت کرو۔ اردو میں ایم.اے.کر کے لڑکی کیا کریگی۔سائنس پڑھ کر سائنٹسٹ بنے گی انشاءاللہ۔ لڑکوں کو بھی ڈاکٹر انجینئر بھی تو بنوانا ضروری ہے۔ورنہ تمہاری طرح وہ بھی کسی پرائیوٹ کالج میں لکچرر ہو کر رہ جائینگے اور پھر زندگی بھر پریشان رہینگے۔دونوالہ کھانا ہی زندگی نہیں ہوتی ہے۔زندگی میں اور بھی بہت ساری ضرورت ہے۔میں اپنے بچوں کو اردو پڑھا کر مصیبت مول نہیں لینا چاہتی ہوں۔کان کھول کر سُن لو۔

کتابوں کی فکر میں مرے جارہے ہو کیا یہ بے جان موٹی کتابیں بڑھاپے میں خدمت گذاری کرینگی۔یہی بچے کام آئینگے انشاءاللہ۔اگر تم ان کتابوں سے اتنی محبت ہے تو ان کو لے کر کسی لائبریری میں شفٹ کر جاؤ۔مجھے ان کتابوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔انہیں کتابوں کو کلیجے سے لگا لو مجھے کوئی ان کتابوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

انوار صاحب بول پڑے۔بیگم خدا کے لئے صبح صبح میری کتابوں کو بددعائیں مت دو۔بڑی جدوجہد سے انہیں جمع کیا ہے''۔

''ہاں ہاں تمہیں تو خواب میں بھی کتابیں آتی ہیں۔بیوی بچوں سے کوئی دلچسپی تو ہے نہیں۔''شرفو بیگم نے غصے میں کہا میں ان کتابوں کی خدمت گذاری نہیں کر

سکتی ہوں۔''

انوار صاحب نے کہا بیگم تم نے نہیں سنا ہے۔

کتاب مہربانم　　　　دانا و خوش بہانم

رہنے دو اپنی شاعری اپنے پاس میں جانتی ہوں کہ کتاب بے جان ہوتی ہے اور کوئی مدد نہیں کر سکتی۔'' شرفو بیگم جلا کر کہا۔

انوار صاحب بولے'' کتابوں سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں ہوتی۔ کتابوں سے بڑھ کر ہمدرد نہیں ہوتا۔''

شرفو بیگم چلانے لگیں۔ صبح صبح دماغ مت کھاؤ اور جا کر جلدی تیار ہو جاؤ ورنہ تمہارا وہ کھوسٹھ دوست آ کر کھڑا ہو جائے گا۔ خود تو اس نے شادی بیاہ نہیں کیا ہے صرف رسالوں، کتابوں اور اردو ادب کی باتیں کرتا ہے تمہیں بھی اپنی طرح کتابوں میں پھنسا کر رکھنا چاہتا ہے۔ اس کے گھر شفٹ کر جاؤ ٹھیک رہے گا دونوں سر جوڑ کر اردو ادب کی ترقی کے پروگرام بناتے رہنا۔ کوئی روک ٹوک نہیں رہے گا۔ مجھ سے امید مت کرو۔ میں تو اپنے بچوں کے ساتھ محنت کرونگی ان بے جان کتابوں کے ساتھ وقت برباد نہیں کر سکتی ہوں۔''

انوار صاحب چڑھانے کے موڈ میں شرفو بیگم کو کہا'' کتابوں کی اہمیت ابھی پتہ نہیں لگ رہی ہے۔ جب بچے باہر چلے جائینگے تو انشاءاللہ یہی کتابیں ہم لوگوں کا دل بہلائینگی''۔

ہاں ہاں ضرور ضرور اس وقت تو آنکھیں ضرور ٹھیک رہے گی جو کتابیں پڑھتی رہوں گی اور تندرستی ٹھیک رہے گی کہ کتابوں کے دیمک صاف کرونگی۔

نوک جھوک کے بعد انوار صاحب غسل خانے میں نہانے چلے گئے شرفو بیگم باورچی خانے میں چلی گئیں۔ بچے پڑھ رہے تھے گھر میں سناٹا ہو گئی۔

انوار صاحب سوچ رہے تھے کہ پچیس سال میرے ساتھ رہ کر بھی شرفو بیگم کو کتابوں سے کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔ شرفو بیگم کو کتابوں سے ایسی نفرت ہے جیسے کسی عورت کو اپنی سوتن سے ہوتی ہے۔ اللہ اُنہیں نیک توفیق عطا کریں (آمین)۔

ننھا فقیر

رانچی اسٹیشن پر میں اپنی نواسی علویہ کے ساتھ کھڑی تھی اور میرے سامنے ایک ننھا فقیر کھڑا تھا عمر مشکل سے چھ سال کی ہوگی۔ میلا چکٹ، ناک بہہ رہی تھی۔ کپڑے کے نام پر اس کے جسم پر صرف ایک لنگوٹی تھی۔ وہ بار بار ہمارے سامنے ہاتھ پھیلا کر پیسے مانگ رہا تھا اور کبھی اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے بھوکے ہونے کا ذکر کر رہا تھا۔ چہرا اتنا گندہ تھا کہ اس کا اصلی رنگ کیا ہے پتہ لگانا مشکل تھا۔ بال کافی بڑے بڑے تھے اور وہ بار بار اپنے بال نوچ رہا تھا شاید اس میں جوئیں بھی تھیں۔ ننھا فقیر میری طرف ہاتھ پھیلا کر پیسے مانگ رہا تھا۔ روٹی کی فرمائش کر رہا تھا۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا ہم بھوکے ہیں میم صاحب میرے باپ ماں نہیں ہیں میم صاحب۔

جو بچہ ٹھیک سے بول بھی نہیں پا رہا تھا۔ وہ کس آسانی سے رٹے رٹائے جملوں کو دہرا رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں اس ننھے فقیر پر مجھے اس قدر پیار آ گیا۔ دل چاہا اسے گود میں اُٹھا لوں اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیروں اور کلیجے سے لگا لوں پر میں ایسا کچھ نہیں کر پائی کیونکہ اگر میں نے ایسا کیا تو لوگ شاید مجھے پاگل سمجھیں گے اور میرا مذاق اُڑائیں گے۔ وہ معصوم بچہ میرا منھ دیکھ رہا تھا شاید اسے اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ میں اس کو کچھ دونگی نہیں لیکن مین نے اس کے ہاتھ میں ایک پچاس کا نوٹ رکھ دیا تو وہ میرا منھ تکنے لگا شاید وہ اسے روی کاغذ سمجھ رہا تھا لیکن میں نے اسے بتایا بیٹا یہ

پچاس روپئے کا نوٹ ہے۔ ننھے فقیر نے روپئے کو غور سے دیکھا اسے تو چند سکوں کی عادت تھی۔ روپئے کو مٹھی میں لے کر وہ وہاں سے جانے والا تھا کہ میں نے اسے روکنا چاہا اور اس کے گھر کے بارے میں پوچھا لیکن وہ تیزی سے وہاں سے چلا گیا۔ میں نے اس کا پیچھا کیا کچھ دور جانے کے بعد وہ ایک جھونپڑی نما گھر کے پاس کھڑا ہو گیا۔ جہاں وہ ایک عورت کے گود میں بیٹھ گیا اور اپنے کو چھپالیا۔ شاید اسے ڈر لگ رہا تھا کہ اس کا جھوٹ نہ پکڑا جائے۔ بچے کو پیدا ہوتے ہی جھوٹ بولنے کی عادت ڈالی جاتی ہے۔ جو وہ اس قدر صفائی سے بول لیتا ہے۔ میں نے اس کے جھونپڑے کے پاس کھڑے ہو کر اس عورت سے بات کرنے کی کوشش کی۔ اس عورت نے بتایا کہ اس کا نام چندہ ہے۔ اس کا پیشہ بھیک مانگنا ہے۔ وہ بولی میری ماں، ماں کا ماں اور شاید اس کی بھی ماں بھیک مانگنے کا پیشہ کرتی تھیں۔ ہم لوگن کو بچپن سے بھیک مانگنے کے طریقے سکھائے جاتے ہیں۔ چندہ نے مجھے بتایا کہ ''ہم لوگ بچے کو بھیک مانگنے کا طریقہ سکھاتے ہیں۔ مندر کے سامنے کھڑے ہو تو بھگوان کا نام لوگ ماتا جی، پتا جی بولو اگر مسجد کے سامنے کھڑے ہو تو اللہ کی راہ پر بولو۔ خدا کا نام لو اور اماں جی ابا جی بولو۔ جمعہ کو نماز کے وقت اور مندر میں پوجا اور آرتی کے سمئے ہم لوگ جاتے ہیں۔ ضرورت ہو تو اندھا بہرہ بن کر مانگ لیتے ہیں۔ ہم لوگن کا کبھی کبھی بدن میں کپڑے لپیٹ کر زخمی ہونے کا طریقہ بھی کام آجاتا ہے۔

چندہ نے مجھ سے کہا'' میم صاحب آپ یہاں تک آئی کس لئے ہیں ہم لوگوں کے پاس کوئی اچھے لوگ نہیں آتے ہیں اور خاص کر کوئی عورت تو کبھی نہیں آتی ہیں۔ آپ کو اس کوڑے میں بیٹھا بھی تو نہیں سکتے پر آپ اپنے آنے کا کارن بھی تو بتا دیں''۔ چندہ بار بار میرے آنے کا کارن پوچھ رہی تھی میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا جواب دوں۔ آخر ہمت کر کے میں نے کہہ دیا۔

''تم لوگ نے جو پیشہ اختیار کیا ہے وہ تو اب ختم نہیں ہوگا لیکن تم لوگ اپنے بچوں کو پڑھا لکھا سکتی ہو۔ خود بھی کوئی کام کر سکتی ہو۔ سرکار کی مدد سے کوئی چھوٹا موٹا کام کر سکتی ہو۔''

میرا جملہ ابھی پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ چندہ زور سے ہنس پڑی جیسے وہ میری بات کا مذاق اُڑا رہی ہو۔

چندہ نے جواب دیا''میم صاحب یہ ہم لوگوں کے پورے پریوار کا پیشہ ہے جسے اب ہم لوگ چھوڑ نہیں سکتے ہیں۔ ہم لوگ سرکاری چکر میں نہیں پڑتے ہر جگہ رشوت اور چوری ہے۔ تیج تہوار پر ہم لوگوں کی اچھی خاصی کمائی ہو جاتی ہے پھر محنت ہم کاہے کریں۔''

ہم نے چندہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ تم لوگوں کی زندگی جیسی بھی گذر رہی ہے۔ پر بچوں کو اسکول بھیجو۔ اُنہیں سر اُٹھا کر جینے کے لائق بناؤ تمہارے بچے دن بھر اِدھر اُدھر بھیک مانگتے ہیں وہ غلط لوگوں کے ہاتھوں میں پڑ کر برباد بھی ہو سکتے ہیں ان کو اچھا انسان بننے دو۔''

میری بکواس کا کوئی اثر چندہ پر نہیں ہو رہا تھا۔ اُس پاس کی بھیک مانگنے والی عورتیں بھی وہاں پر آگئیں اور مجھے دیکھنے لگیں۔ کسی ایک عورت نے کہا۔

''میم صاحب اپنا ٹیم برباد مت کرو ہم لوگ جنم سے ہی بھیک مانگتے ہیں اور مرتے سمئے تک بھیک مانگتے رہیں گے۔ ہم لوگوں کا بھاگ کوئی بدل نہیں سکتا۔ ہم لوگ جنم سے ہی بھیک منگے ہیں۔ بھیک مانگنا کوئی پاپ نہیں چوری تو نہیں کرتے ہم لوگ۔''

ننھا فقیر جو ابتک اپنی ماں سے چمٹا ہوا تھا ماں کی آنچل سے نکل کر اپنی جھونپڑی میں گھس گیا اور وہاں سے مجھے گھور رہا تھا۔ شاید اسے کچھ عجیب سا لگ رہا

تھا۔اپنی اپنی جھونپڑی سے کچھ بچے اپنے ہاتھ میں کٹورے لے کر نکل گئے اپنی ماں کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے ۔ان بچوں کی ماں نے ان لوگوں کو بتایا کہ وہ الگ الگ جگہ پر جائیں گے اور شام تک لوٹ کر آجائیں گے اپنی ماں کے حکم کے مطابق بچے اپنے کام پر نکل گئے سب ہی بڑی بُری حالت میں تھے۔

عورتیں بھی آپس میں باتیں کرنے لگیں ان لوگوں کو بھی اپنے کام پر جانا تھا۔

ایک عورت نے مجھ سے کہا''میم صاحب،ہم لوگن کی عادت بھیک مانگنے کی کچھ ایسی ہو گئی ہے ک اس کے بنا نیند نہیں آتی ۔بھوک نہیں لگتی اس نے ہم لوگن کو اپنے حال پر چھوڑ دیں۔ہم لوگوں کا پتی کاہل ہے اور وہ کبھی کبھی اندھا لنگڑا بن کر کچھ کما لیتا ہے نہیں تو ہم لوگن کی کمائی پر حق جماتا ہے بلکہ وہ تو بچے لوگن سے بھی پیسے مانگ لیتا ہے''۔ایک شخص ننھے فقیر کی ماں چندہ کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا میں نے محسوس کیا کہ وہ ننھے فقیر کا باپ لگتا ہے اس نے بتایا۔

''ہم نے سارے چلڑ ریزگاری دوکاندار کو دے دئے اور اس کے بدلے نوٹ لا دیا ہے تم جا کر سودے لے آنا۔'' دوسری عورت نے کہا''اپنا سمئے برباد مت کرو میم صاحب ۔ہم لوگوں کے ساتھ ہمدردی جتانے کی کوشش نہ کرو اپنے گھر جاؤ۔ یہ سب پیار ہمدردی ایک ناٹک ہوتا ہے۔ میں بھاری قدموں سے واپس آ رہی تھی لیکن عورتوں کے بولنے کی آواز میرا پیچھا کر رہی تھی۔ کسی نے کہا۔

سرکار تو خود حرامی ہے۔چور افسر ہے۔سرکار نے ہم لوگن کے لئے گھر بنوا دیا تھا پر وہاں بھی افسر لوگ ہم لوگن کے کھانے میں کٹوتی کر کے پیسے مار لیتا تھا۔''

دوسری عورت نے کہا پولس والا تو اور بھی کمینہ ہے۔ہم لوگن کے بیٹھنے کی جگہ کا پیسہ وصول کرتا ہے۔یہ سب سرکار کی نکمی ہے تو کیا کرینگے''۔

میں آ رہی تھی ننھا فقیر میری طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو میم

صاحب مجھے انسان بنا دو۔ میم صاحب مجھے نیا جیون دے دو۔ میم صاحب مجھے اس غربت اور گندگی سے نکال لو میم صاحب مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔

لین میں مجبور تھی بالکل مجبور۔ مڑ مڑ کر اس معصوم کو دیکھ رہی تھی۔ ننھا فقیر مجبور تھا۔ ننھا فقیر نادان تھا۔ ننھا فقیر معصوم تھا۔

ننھا فقیر میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا لیکن میری آنکھوں سے آنسوں کے چند قطرے ٹپک پڑے۔

ہیرے کی بیسر

رجنی کو بچپن سے ہیرے کی بیسر کا بہت شوق تھا۔ وہ ایک غریب گھرانے کی لڑکی تھی۔ چار بھائی بہن اور ماں باپ چھ لوگوں کا خرچ پورا ہونا مشکل ہو جاتا اس لئے رجنی کی ماں رادھا بھی سلائی وغیرہ کر کے کچھ کما لیتی تھی تب جا کر کھینچ تان کر خرچ پورا ہوتا تھا۔ چاروں بچے پڑھ رہے تھے سب کے اخراجات پورے کرنے اور ہر چھوٹی بڑی ضرورت پوری کرنے میں ہی سب پریشان رہتے تھے۔ رجنی کے پتا پرائیوٹ اسکول کے ٹیچر تھے۔ رجنی کے دل میں ہیرے کی بیسر کا شوق بچپن سے پل رہا تھا لیکن پورا کرنا مشکل تھا۔ اپنی اس خواہش کو اس نے دبا دیا تھا اور سوچتی تھی کہ جب وہ خود کمانے لگے گی تو اس خواہش کو ضرور پوری کریگی۔ اس خواہش کو دبا کر وہ خاموش رہتی اور آخر بی۔اے۔ اور پھر بی۔ایڈ بھی کر گئی اور پھر اس کی شادی کی بات بھی طئے ہو گئی۔ بینہ لین دین کے رجنی کی شادی طئے ہو گئی۔ لڑکا کسی آفس میں کلرک تھا۔ گھر والے لوگ خوش تھے کہ رجنی خوش نصیب ہے کہ بغیر تلک جہیز کے اس کی شادی طئے ہو گئی ہے۔ لڑکا سرکاری نوکری میں ہے۔ دیکھنے میں اچھا اور اچھے خاندان کا ہے۔ ایک دن رجنی کی شادی کی تیاری بھی ہونے لگی۔ رجنی نے بھی ایک پرائیوٹ اسکول

میں جوائن کرلیا۔ چھوٹے بھائی رومی نے بھی کچھ ٹیوشن شروع کر دیا۔ کچھ ماں کا پیسہ کچھ رومی کے ٹیوشن اور کچھ رجنی کا مشاہرملا کر پچاس ہزار ہو گئے۔ رجنی کی ماں رادھا سے سامانوں کی فہرست بنالی اور رجنی چھوٹی ہے روما اور بھائی رومی کو لے کر بازار نکلے تین چار گھنٹوں کے بعد وہ لوگ بازار سے آئے تو رادھا بہت خوش ہوئی۔ مختصر پیسوں میں ان لوگوں نے ضرورت کی سب چیزیں لے لی تھیں۔ رجنی نے ماں سے ہیرے کی بیسر کا ذکر کیا۔ جس پر اس کی ماں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اتنے مختصر پیسوں میں ہیرے کے بیسر کہاں سے ہوگی۔ رجنی کے بچپن میں جو ہیرے کی بیسر صرف تین سو میں تھی اب اس کی قیمت تین ہزار ہوگئی تھی۔ رجنی نے اپنے اس شوق کو دل میں دفن کر دیا اور خاموش ہوگئی اور پھر اس کی شادی ہوگئی اور وہ سسرال چلی گئی۔ کچھ دنوں میں ہی اسے اس بات کا احساس ہوگیا کہ اس کا پتی سریش اچھے گھر کا اچھی شکل صورت کا ہے لیکن اس کی فطرت اچھی نہیں وہ کماتا اور اپنے دوستوں پر خرچ کرتا۔ گھر کی ذمہ داریوں کو کبھی سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ دھیرے دھیرے رجنی پر گھر کی ذمہ داریاں بڑھتی گئیں اور سریش آزاد زندگی گذارتا۔ رجنی اسکول کی نوکری، گھر کا کام کر کے ٹیوشن کا وقت بھی نکال لیتی۔ اس کے دو بچے بھی ہو گئے لیکن سریش ہر بات میں بحث کرتا اور رجنی گھر کے امن آمان کی وجہ کر خاموش ہو جاتی لیکن ہیرے کی بیسر کی خواہش اس کے دل سے نکلی نہیں تھی۔ دل میں سوچتی شاید زندگی میں اس کی یہ تمنا ہیرے کی بیسر خریدنے کی پوری نہ ہو سکے گی۔

رجنی کے دونوں بچے رما اور دیوا کر پڑھنے میں بہت اچھے تھے۔ محنتی تھے دونوں کے اسکول کی فیس معاف تھی ساتھ ہی ان لوگوں کو وظیفہ بھی ملتا تھا۔ آج بھی رجنی کے دونوں بچوں کو وظیفہ ملنے والا تھا۔ رجنی نے دونوں بچوں کو کہا تھا کہ وہ لوگ ان پیسوں سے اپنے لئے کپڑے چپل اور جوتے خرید لینگے ان لوگوں کے پاس اچھے

کپڑے اور جوتے نہیں تھے۔ جبکہ رجنی کی بیٹی رما نویں کلاس میں اور بیٹا آٹھویں درجہ میں پڑھتا تھا۔

جب بچوں کو اسکول سے آنے میں دیر ہوئی تو رجنی گھبرانے لگی۔ بار بار گھبرا گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی کہ دونوں بچے آتے دکھائی دیتے لیکن رجنی کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ بچوں کے ہاتھ میں ایک پیکٹ نہیں تھا۔ رجنی نے سوچا شاید ان لوگوں کو وظیفے کی رقم نہیں ملی تھی یا وقت نہ ملا ہوگا لیکن اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں جب رجنی نے دیکھا کہ رما کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی لال رنگ کی ڈبیا ہے۔ اس نے ماں کے ہاتھ میں ڈبیا پکڑا دیا۔ رجنی نے اسے کھول کر دیکھا تو اس میں ایک ہیرے کی بیسر تھی۔ رما اور دیوا کرنے بتایا کہ ان لوگوں کو پندرہ ہزار روپیہ ملا تھا جس میں ان لوگوں نے بارہ ہزار کی ہیرے کی بیسر اور دو ہزار کی کتابیں خرید لیں ایک ہزار نقد ان لوگوں نے اپنی ماں کے ہاتھ میں دیدیا۔ رجنی نے دونوں بچوں کو اپنے گلے سے لگالیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ رجنی کو ایسا محسوس ہوا جیسے زندگی میں اسے ہر خوشی مل گئی ہو۔ اس کے خواہش پوری ہوگئی اس کے خواب پورے ہو گئے۔ بچپن کی ہیرے کی بیسر کی خواہش اس کے بچوں نے پوری کردی۔ رجنی نے اپنے بچوں کو ہزاروں دُعائیں دیں کاش ایسے بچے بھگوان سبھی کو دیں۔ اسے ساری تکلیفوں کا صلہ مل گیا۔

اماں ڈولر بھیج رہا ہوں

آج زبیدہ باجی کا انتقال ہوگیا۔ کئی دنوں سے ان کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ اللہ رسول کے بعد وہ اپنے دونوں بیٹوں توحید اور ولید کو بار بار یاد کر دیتی تھیں۔ آخر وقت میں تو ایک محلے والی نے اپنے دونوں بیٹوں کو ان کے سامنے کر دیا کہ توحید اور ولید آ گئے ہیں۔ زبیدہ باجی نے ہاتھ پکڑ کر کہا، بیٹے بہت دیر کر دیا اور پھر انہوں نے

آنکھیں بند کر لیں۔

زبیدہ باجی نے بڑی تکلیفیں اُٹھائیں تھیں۔ محلے کی عورتیں اور رشتہ داروں نے ان کا ساتھ دیا۔ سب زبیدہ باجی کو بہت پیار کرتی تھیں۔ سب نے ان کے ہر دُکھ سُکھ میں ان کو سہارا دیا تھا۔ زبیدہ باجی اسی گھر میں دلہن بن کر اُتری تھیں۔ شادی کے بعد انہوں نے اپنے ساس سسر کے ساتھ اس گھر میں دس سال گذارے تھے۔ ساس سسر سے بہت پیار ملا لیکن ان کی شادی کے صرف دس سال کے اندر دونوں گذر گئے۔ ان لوگوں کے انتقال کے بعد زبیدہ باجی کے شوہر واحد صاحب کی تندرستی بھی خراب ہونے لگی۔ زبیدہ باجی نے ان کے علاج میں کوئی کمی نہیں کی۔ پٹنہ میں علاج کے بعد جب کوئی فائدہ نہیں ہوا تو انہوں دلّی اور پھر بلور میں بھی علاج کرایا۔ خود ساتھ گئیں لیکن ان کے زندگی کے دن پورے ہو گئے تھے اور ہر ایک دن واحد صاحب نے ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ زبیدہ باجی نے علاج کے لئے اپنی خاندانی سسرال کی زمین اور اپنے زیور بھی فروخت کر دیئے تھے۔ اب زبیدہ باجی کے پاس یہ خاندانی چھ کمروں کا مکان رہ گیا تھا۔ زبیدہ باجی نے بہت صبر سے کام لیا اور اپنے آنسو پوچھ لئے۔ دو بیٹوں کے مستقبل کا سوال تھا۔ زبیدہ باجی نے چھ کمروں میں چار کمروں کو کرائے پر لگا دیا اور اپنی زندگی دو کمروں میں گذارنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے اپنی ضرورتوں کو محدود کر دیا۔ انہوں نے بچوں کی تعلیم پر پورا دھیان دیا۔ زبیدہ باجی کی زندگی سمٹ گئی۔ ان کی خواہش سمٹ گئیں۔ کچھ رشتہ داروں نے مدد کے لئے ہاتھ ضرور بڑھایا لیکن زبیدہ باجی جیسی خودّار عورت نے مدد نہیں لیا۔ سب کا شکریہ ادا کر دیا۔ بچوں کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ واحد صاحب کے انتقال کے وقت توحید آٹھ سال کا اور ولید چھ سال کا تھا۔

محلے والی عورتیں زبیدہ باجی کو دل سے پیار کرتی تھیں۔ اپنے اپنے رشتے لگا

کر کوئی بھابھی کوئی باجی اور کوئی چچی کہتیں۔ زبیدہ باجی محلے والوں کے ہر خوشی اور غم میں شریک ہوتیں۔ لوگ ان کو ایک مثالی عورت مانتے تھے۔ عورتیں رائے مشورہ لیتیں اور ان کی بات کو پتھر کی لکیر مان کر چلتیں۔

کسی دن زبیدہ باجی کو ہلکا سا زکام بھی ہو جاتا تو عورتیں طرح طرح کی دوائیں لے کر آجاتیں اور کوئی گھر سے کاڑھا بنا کر لاتی۔ وقت تیزی سے گذر رہا تھا۔ بچے بھی بڑے ہو رہے تھے اور ایک دن ایسا بھی آیا کہ توحید نے آئی. ایس. سی. کر لیا اور پھر اُس کا داخلہ میڈیکل کالج میں ہو گیا۔ زبیدہ باجی بہت خوش ہوئیں۔ شکرانے کی نماز پڑھی اور اپنے ہاتھ سے لڈو بنا کر سب کو کھلایا۔ توحید کی تعلیم کا سلسلہ پٹنہ میں چلتا رہا کم خرچ میں کام چل رہا تھا۔ زبیدہ باجی محلے والی عورتوں کو ہمیشہ کہتیں جب ہمارا توحید انشاء اللہ ڈاکٹر بن جائے گا تو سب کی پریشانی دور ہو جائیگی۔ سب کا علاج مفت میں ہو جائیگا۔ بلکہ زبیدہ باجی توحید سے پوچھ پوچھ کر عورتوں کو دوائیں دلواتیں۔

اس وقت زبیدہ باجی کی خوشی دوگنی ہو گئی جب ان کو خبر ملی کہ ولید کا داخلہ بھی انجینیئرنگ کالج میں ہو رہا ہے۔ انہوں نے شکرانے کی نماز ادا کی۔ یتیم بچے آج ماں کے سائے میں رہ کر تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

زبیدہ باجی کی یہ خوشی زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکی کیونکہ توحید نے خبر سنایا کہ اس کو امریکہ کا وظیفہ مل رہا ہے اور وہ جانا چاہتا ہے۔ زبیدہ باجی نے اسے روکنے کی کوشش کی کہ یہ وظیفہ اسے یہاں بھی مل سکتا ہے۔ اپنی تعلیم سے وہ اپنے ملک والوں کو فائدہ پہنچائے لیکن وہ کسی طرح تیار نہ تھا اور آخر وہ امریکہ روانہ ہو گیا۔ زبیدہ باجی بہت مایوس ہو گئیں۔ کئی دنوں تک اُنہوں نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ پر محلے والوں کے سمجھانے سے کچھ تسلی ہوئی۔ سات سمندر پار بیٹے کو بھیج کر وہ بے چین رہیں۔ پھر ایک دن توحید کا فون آیا کہ اس نے ایک پاکستانی خوبصورت لڑکی پسند کر لی ہے اور

جلد شادی کرنا چاہتا ہے۔لڑکی ڈاکٹر ہے۔توحید نے ماں کو بہت بلایا۔ بیٹے کو آنگن میں سنوارنے کا شوق تھا جو سات سمندر پار جا کر پورا کرنا ہوگا۔شوق سے زبیدہ باجی امریکہ جانے کو تیار ہوگئیں۔ ویزا بھی آگیا چند جوڑے دولہن کے اور بیٹے کی شیروانی لے کر وہ ولید کے ساتھ امریکہ چلی گئیں۔ چند رشتہ داروں اور چند دوستوں کے سامنے توحید کی شادی ہوگئی۔ نہ گیت نہ باجا نہ کوئی بھیڑ بھاڑ۔ چند دنوں میں ہی زبیدہ باجی کا دل گھبرانے لگا۔ بیٹا بہو اپنے نوکری کے سلسلے میں باہر رہتے اور ولید اِدھر اُدھر رہتا۔امریکہ کی چکا چوند نے اس کو بے چین کر دیا تھا اور وہ بھی وہاں رہنے کا خواہش مند نظر آرہا تھا۔زبیدہ باجی نے بیٹے سے واپسی کا تقاضہ شروع کر دی اور پھر ایک دن وہ ولید کے ساتھ اپنے وطن اپنے گھر لوٹ آئیں۔جس گھر میں ان کے ساس سسر رہے۔جس گھر میں وہ دُلہن بن کر آئیں جس گھر میں ان کے شوہر کی پرورش ہوئی بلکہ آخری سانس لی جس گھر میں ان کے بچے بڑے ہوئے۔اس گھر میں انہوں نے سُکھ دُکھ دیکھا اس گھر سے ان کو بہت پیار تھا آکر انہوں نے سکون کی سانس لی۔ کچھ ہی دنوں میں ولید نے امریکہ جانے کا فیصلہ کرلیا اور پھر وہ بھی روانہ ہوگیا۔دونوں بیٹوں کے جانے کے بعد زبیدہ باجی کی عجیب کیفیت ہوگئی وہ بہت سست ہوگئیں اور خاموش رہنے لگیں۔لڑکوں نے ان کو امریکہ آنے کے لئے کہا لیکن وہ کسی بھی قیمت میں جانے کو تیار نہیں تھیں۔اس عمر میں وہ نئے ماحول میں رہنے کو کسی بھی طرح تیار نہیں ہوئیں۔ بچے ڈولر بھیجتے رہے جب وہ بچوں سے ان لوگوں کی کمی کا ذکر کرتیں فون آتا۔امی ڈولر بھیج رہا ہوں اچھی سی دائی رکھ لیں۔امی ڈولر بھیج رہا ہوں اپنا علاج اچھے سے کرالیں۔ امی ڈولر بھیج رہا ہوں کھانے پینے کا خیال کریں۔ حالانکہ جو ڈولر بچے بھیجتے زبیدہ باجی انہیں لوگوں کے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیتیں۔دھیرے دھیرے زبیدہ باجی کمزور ہوتی گئیں۔بچوں کو خبر ہوئی لیکن سب کی اپنی اپنی مصروفیت تھی اور جلد آنے سے قاصر تھے

اور پھر ایک دن کچھ رشتہ داروں اور محلے والوں کی موجودگی میں زبیدہ باجی نے آخری سانس لی۔ بچوں کو خبر ہوئی تو انہوں نے لاش روکنے کا حکم دیا۔ دو دنوں تک لاش رکھی رہی۔ بیٹے کندھا دینے آ گئے۔ تین دنوں کے اندر باپ دادا کا بسیرا فروخت ہو گیا بیٹوں نے بینک سے پیسے نکالے۔ محلے کی عورتیں روتی ہوئی گھر سے چلی گئیں اور بیٹے بینک سے پیسے نکال کر امریکہ روانہ ہو گئے۔

زبیدہ باجی کو ڈولر سے اس قدر نفرت تھی کہ وہ اس کے نام سے بگڑ جاتی تھیں اور آخری سفر میں بھی ان کے اپنے پیسے خرچ ہوئے ڈولر نہیں۔

بھٹکتی آتما

یہ ۱۹۵۶ء کی بات ہے جب کہ میرا داخلہ آئی۔اے میں ہوا تھا اس وقت شیو پریا دیدی ویمس کالیج میں لائبریرین تھیں لیکن ہم لوگوں کے لئے ایک دوست تھیں سفید ساری سبز ہاتھ میں چند کانچ کی چوڑیاں۔ چہرے کا گہرا کالا رنگ پر چہرے پر چمک کالے ہونٹوں کے پیچھے شفید موتیوں کی طرح چمکتے دانت۔عمر کوئی پچاس سال کے قریب۔ ہنستا مسکراتا چہرا آنکھوں میں چمک۔بال آدھے سفید آدھے کالے۔

لڑکیاں پریہ دیدی کو بہت تنگ کرتیں کوئی کیٹلوک نکالنے کی فرمائش کرتی تو کوئی کتاب نکالنے کی تو کوئی ان کے سامنے سے کتاب اور رسالے آٹھا لے جاتی ۔میں فرصت کے وقت زیادہ تر لائبرری میں بیٹھتی اور ان سے گپ کرتی۔ شیو پریہ دیدی کتابوں کے ساتھ سر کھپاتیں میں ان کو کتابوں کی رانی کہتی۔ وہ کتابوں کی ملکہ اور میں کتابوں کی شوقین وہ میری باتوں پر ہنس دیتی۔ جب میں نے کسی کتاب کی فرمائش کی شیو پریہ دیدی اسے کھوج کر ہمارے حوالے کر دیتیں۔ان کے کہنے پر ہم نے کالی داس کی ہندی کی شکنتلا کا ترجمہ اردو میں کر ڈالا وہ بہت خوش ہوئیں اور ہماری ہندی

ٹیچر جمنا بائی کیس کر کو بتایا انہوں نے بہت خوشی کا اظہار کیا اور ہماری پرنسپل شوبھا ڈے سے بھی کہا اور وہ بھی بہت خوش ہو گئیں۔

ایک دن شیو پریا دیدی کہنے لگیں "میں ہریجن ہوں تم ہمارے ساتھ بیٹھتی ہو کھاتی پیتی ہو کہیں تمہارے گھر والوں کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔

میں نے جواب دیا شیو پر یہ دیدی مسلمانوں میں کوئی ہریجن نہیں ہوتا سب ذات والے ایک ہیں میں نے ان کو یہ شعر سنایا۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

پر یہ دیدی نے اس کا مانے پوچھا ہم نے معنی بتایا تو بہت خوش ہو گئیں اور اسلام مذہب کی تعریف کرنے لگیں ۔ پر یہ دیدی ہمیشہ اپنے بچپن کی باتیں اپنے ہریجن ہونے کا گناہ کا ذکر کرتیں تھیں۔ ان لوگوں کو ہریجن ہونے کی وجہ کر بڑی پریشانیاں اٹھانی پڑی تھیں۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ پر یہ دیدی کے پتا جی ایک کھلے دماغ کے آدمی تھے انہوں نے سر پر میلا ڈھونے کے رواج کی ہمیشہ مخالفت کی اور اپنے بچوں کو اس ماحول سے دور رکھا۔ انہوں نے کوشش کر کے اپنے گاؤں میں سپٹک لیٹرن کا انتظام بھی کروایا۔

پر یہ دیدی نے بتایا کہ میرے پتا جی شروع سے کھلے دماغ کے تھے۔ انہوں نے گاؤں کے اسکول سے ساتواں پاس کیا اور دوسرے گاؤں سے میٹرک۔ شہر سے بی۔ اے۔ بی۔ ٹی کی ٹریننگ کی اور اپنے گاؤں کے اسکول میں ٹیچر ہو گئے اور اسے ہائی اسکول کا درجہ دلایا۔

شیو پیر یہ دیدی اپنے بچپن کا قصہ سناتیں تو ان کی آنکھوں میں انسو آجاتے۔ گوان کے پتا جی اسکول میں ٹیچر تھے لیکن پھر بھی سیو پریا دیدی اور ان کی بہن شیو پر بھا

کوسب بچوں کے ساتھ دری پر بیٹھنے کا حکم نہیں تھا اور وہ لوگ اپنا بورہ لے کر جاتیں تھیں۔ شیو پر یہ دیدی کے پتا نے اس فرق کی مخالفت کی لیکن حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے وہ خاموش ہوگئے۔ گاؤں کے اونچی ذات کے لوگوں کی مخالفت کرنا آسان کام نہیں تھا۔ اسکول کے بعد پر یہ دیدی کے پتا جی نے اپنے چاروں بچوں کو آگے کی پڑھائی کے لئے دوسرے گاؤں میں بھیج دیا اس کے لئے سب کو ندی پار کر کے روز اسکول جانا پڑتا تھا۔ اسکول کی پڑھائی کے بعد شہر کے ہاسٹل میں رکھ کر سب کو اعلیٰ تعلیم دلوایا۔ پر یہ دیدی نے بی۔ اے کر کے لائبریری سائنس کی ٹریننگ لی ان کی چھوٹی بہن نے آئی۔ آے کر کے نرس کی تریننگ لی۔ اس دوران شیو پر بھا کی دوستی ایک اگروال لڑکے سے ہوگئی اور گھر والوں کے ہزار منع کرنے کے باوجود بھی انہوں نے کورٹ میرج کرلیا۔ گاؤں والوں کو جب اس کی خبر ہوئی تو گاؤں میں ہنگامہ ہوگیا۔ پر یہ دیدی کے پتا جی کو ذات سے نکال دیا گیا ان کا حقہ پانی بند ہوگیا۔ پر یہ دیدی نے کہا میرے ماں اور پتا جی تنہا رہ گئے اور لوگوں نے ان کے گھر آنا جانا چھوڑ دیا۔

خود اپنے بارے میں شیو پر یہ دیدی کہتی تھیں کہ ان کی شادی سات سال کی عمر میں کردی گئی تھی اور اگیارہ سال کی عمر میں وہ وِدھوہ ہوگئیں ان کا کہنا تھا کی ''میں تو ودھوہ کی مطلب بھی نہیں سمجھتی تھی تبھی مجھے بتایا گیا کے میں ودھوہ ہوگئی ہوں مجھے سفید ساڑی پہنا دی گئی اور سندور پوچھ دیا گیا۔ ماس (گوشت) مچھلی کھانا منع ہوگیا جب کہ مجھے دونوں چیزیں بہت پسند تھیں۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا تم تو کھاتی ہوگی مسمانوں کے یہاں کا ماس تو بہت مزیدار ہوتا ہے ہمارے گاؤں کی لڑکیاں بتاتی تھیں ۔میں نے تو زندگی بھر کے لئے اس شوق کو دبا دیا''۔

میں نے ان کو بتایا کہ ''میں بھی گوشت اور مچھلی کی بھی بالکل شوقین

نہیں ہوں سبزی زیادہ پسند ہے''انہیں بڑا تعجب ہوتا ایک مسلمان گھر کی لڑکی اور صرف سبزی پسند کرتی ہے۔

ایک دن شیو پر یہ دیدی نے مجھے بتایا کہ'' گاؤں میں ہم لوگوں کا مندر الگ تھا۔ بڑے مندر میں صرف اونچی ذات کے لوگ جاتے تھے ہم لوگ دور سے تماشہ دیکھتے تھے۔ کنواں بھی ہم ہریجنوں کے لئے الگ تھا اور اونچی ذات کے لوگوں کے لئے کنواں الگ تھا جہاں ہریجنوں کو بھٹکنے تک نہیں دیا جاتا تھا۔ شیو پربھا کی وجہ کر لوگوں نے پتاجی کے پاس آنا جانا بند کر دیا تھا۔ میں مہینہ میں ایک بار جاتی ان کی دوائیں اور ضرورت کی چیزیں لے جاتی۔ ہمارے دونوں بھائی ڈاکٹر بن چکے تھے اور پتاجی ریٹائر ہو چکے تھے۔ ہم سب نے بہت کوشش کیا کہ پتاجی کسی طرح ہم لوگوں کے پاس آ جائیں لیکن ماں پتاجی کسی طرح تیار نہیں ہوئے۔ ماں تو چلی بھی آتی لیکن پتاجی کا کہنا تھا کہ جہاں جنم ہوا ہے مرن بھی وہیں ہوگا انہیں اپنی جنم بھومی سے بہت پیار تھا''۔

بولتے بولتے پر یہ دیدی رونے لگتیں۔

میں کلاس کرنے چلی گئی اور پر یہ دیدی بھی اپنے کاموں میں لگ گئیں۔ جب بھی وقت ملتا میں ان کے پاس آ کر بیٹھ جاتی تھی۔ ایک دن شیو پریا دیدی نے کہا لوگوں نے مجھے دوسری شادی کے لئے کہا لیکن سماج کے ڈر سے ایسا سوچنا بھی پاپ تھا۔ میں شیو پریا دیدی کی زندگی کی پوری کہانی سننے میں دلچسپی رکھتی تھی اور ان سے چھیڑ چھیڑ کر پوچھتی رہتی تھی۔

ایک دن پر یہ دیدی نے کہا کہ'' میرے پتاجی بزرگ ہو گئے تھے اور اکیلے رہ رہ کر چڑ چڑے ہو گئے تھے اور بیمار بھی رہنے لگے تھے اور ایک دن وہ ہم سب کو چھوڑ کر بھگوان کے پاس چلے گئے۔ میرے دونوں ڈاکٹر بھائیوں نے اپنی اپنی پسند کی ڈاکٹر

لڑکیوں سے شادیاں کرلی تھیں یہ بات اور بھی ناپسندیدہ تھی سب کے لئے۔ پتاجی کی موت کے وقت ہم سب بھائی بہن اور میری بہن کا پتی اگروال موجود تھا لیکن گاؤں والوں نے ہم لوگوں کے گھر آنا بھی گوارا نہیں کیا۔ ہم سب بھائی بہن نے ہر کے گھر جاکر ہاتھ جوڑکر کہا پر کوئی شریک نہیں ہوا۔ پتاجی کا دیہانت ستر سال کی عمر میں ہوا تھا باجے گاجے سے ارتھی اٹھتی پر باجے والا بھی آنے کو تیار نہیں ہوا ہم لوگوں نے بہت خوشامد کی۔ آخر ہم سب بھائی بہن نے داہ سنسکار کیا''۔

یہ کہہ کر شیو پریا دیدی پھوٹ پڑیں اور کہنے لگیں ''آج بھی وہ باتیں یاد آتی ہیں تو من بہت دکھی ہوتا ہے۔ جس انسان نے گاؤں کی ترقی کے لئے اتنی کوشش کی اس کو اپنے بچوں کے کارن اتنا دکھی مرنا پڑا۔ پتاجی کی آتما کی شانتی کے لئے شرادھ بھی توضروری تھا۔ پتاجی کے شرادھ کے لئے ہمائے بھائیوں نے گاؤں والوں کے ہاتھ جوڑے بڑی منتیں کیں تو دو شرط پر لوگ تیار ہوئے''۔

شیو پریہ دیدی تھوڑی دیر خاموش رہیں اور اپنے آنکھوں کو انچل سے چھوپا لیا۔ میں خاموش ہوگئی اور وہ بھی خاموش رہیں۔

دوسرے دن شیو پریہ دودی نے کہا منتیں کرنے کے بعد گاؤں کی پنچائت نے فیصلہ دیا کہ پورے گاؤں والوں کو بھوجن کرائیں اور پنچایت کے سامنے مافی مانگیں کہ جس جس نے دوسری ذات کے لڑکا لڑکی سے شای کیا ہے وہ اس گاؤں میں دوبارا قدم نہیں رکھے گا۔ سب سے پہلے تو شیو پربھا کو جانے کا حکم دیا گیا۔ وہ پتاجی کے شرادھ کے لئے رکی تھی سن کر رونے لگی اور پانچ ہزار روپیہ دیکر وہ اور اس کا پتی گاؤں سے چلے گئے۔ وہ زور زور سے رو رہی تھی گاؤں کی پگڈنڈی پر وہ روتے جارہی تھی اور ہم لوگ اس کی آواز سن کر رو رہے تھے۔

پتاجی کے تیرہویں کے بعد ہم لوگوں نے گاؤں کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا

دوبارہ اس گاؤں میں ہم لوگوں نے قدم نہیں رکھا سنا ہم لوگوں کے گھر اور کھیت پر آونچی ذات والوں کا قبضہ ہو گیا ہے۔ مجھے اس سماج اور دقیانوسی لوگوں سے سخت نفرت ہے۔ لائبریری میں میرا رشتہ سب سے ہے اور خاص کران کتابوں سے ہے جو بے زبان ہیں لیکن میری سب سے بڑی دوست۔

میرے پتا جی کو اپنے گاؤں گھر اور کھیت سے بہت پیار تھا آج بھی ان کی آتما کو بھٹکتے دیکھتے ہیں کبھی وہ لوگ گھر کی کنڈی پکڑ کر کھڑے دیکھتے ہیں تو کبھی کھیتوں کے منڈیر پر اور کبھی اسکول کے کمپونڈ میں کھڑا پاتے ہیں ہم لوگوں نے پتا جی کا پتر پکچھ میں گیا جا کر پنڈ دان کروادیا ہے ان کی آتما کی شانتی کے لئے۔ بھگوان ان کی بھٹکتی آتما کو شانتی دے۔

میں بھلا نہیں پاؤں گی

بگودر ہزاری باغ کے پاس ہرے بھرے جنگلوں سے سجا سجایا ایک گاؤں ہے۔ اب سے پچاس ساٹھ سال قبل سب چھوٹا ناگ پور میں تھا جو پہاڑوں سے گھرا ایک حسین وادی دکھائی دیتا تھا۔ ہمارے ایک رشتے کے بہنوئی کا تبادلہ وہاں کے اسپتال میں ہوا وہ ڈاکٹر تھے۔ مسلمانوں کی آبادی وہاں تھی جو مذہب سے دور ،اچھے طور طریقوں سے دور، تعلیم سے دور زندگی گزار رہے تھے۔ عورتوں میں تو تعلیم کا رواج بالکل نہیں تھا۔ میں بار بار باجی کے بلانے پر وہاں گئی اور تین ماہ رہ گئی۔ وہاں کے مسلمانوں کے طور طریقہ دیکھ کر عجیب سا لگا۔ ہر گھر میں درجنوں مرغیاں جو گندگی کرتی رہتیں اور اطمینان سے چوکی پلنگ پر گھومتی رہتیں۔ صبح کے وقت درجنوں مرغی کے بچے چہل قدمی کرنے نکل جاتے اور اسی حساب سے انسانوں کے بچے بھی ہر عمر کے اور ہر سائز کے نکل جاتے اور دن بھر گندگی میں

کھیلتے رہتے جیسے کسی پارک میں گھوم رہے ہیں۔

مجھے ان لوگوں کی زندگی کے بارے میں جاننے کی بڑی خواہش ہوتی لہٰذا اکثر میں ان لوگوں کے جھوپڑی نما گھر میں جاتی اور ان لوگوں کی زندگی کا معائنہ کرتی۔ صبح کے وقت مائیں کالی چائے (بغیر دودھ کی چائے) ایک کٹورے میں پکڑا دیتیں اور ایک دو روٹی بچے بڑی خوشی سے نوش فرماتے۔ کسی کسی گھر میں گائے یا بھینس تھی لیکن دودھ گوالے دوہ کر ہوٹل پہنچا دیتے۔ مرغی کے انڈوں کا بھی وہی حال تھا۔ سب جمع کر کے دکاندار لے جاتا اور دودھ اور انڈوں کے عوض میں مردوں کے ہاتھوں میں پیسے دے جاتا۔ اس سے گھر کی دوسری ضرورتیں پوری ہوتی۔ عورتوں اور بچوں کو تو شاید ہی انڈہ اور دودھ نصیب ہوتا۔ صرف گھر کے مردوں کو دودھ کی چائے ملتی۔

مسلمانوں کی آبادی میں جہالت گندگی اور افلاس کچھ زیادہ تھی۔ چھوٹے بچوں کے ناکوں سے گندگی بہتی اس پر مکھیاں بھنبھناتیں۔ اس وقت میری عمر دس سال کے قریب تھی میں اکثر سوچتی کہ اتنے بچے کیوں ہوتے ہیں جن کی وہ پرورش اچھے سے نہیں کر سکتے ہیں۔ ہماری باجی جان خود اولاد سے محروم تھیں بچوں کو پڑھانے کا بیڑا اُٹھایا۔ ان لوگوں کے لئے سلیٹ پینسل اور اردو کی ابتدائی کتابوں کا انتظام خود کیا اس کارِ خیر کے لئے انہوں نے کسی سے مدد نہیں لی حالانکہ بچے پڑھنے کے معاملہ میں طرح طرح کے بہانے بناتے۔ باجی جان نے لڑکیوں کو بھی بلایا لیکن ان کی مائیں اپنے ساتھ کھیتوں میں کام کرنے کے لئے لے جاتیں اور وہ مشکل سے پڑھ پاتیں۔ بھائی بہن کو کھلانا ان کا فرضِ اولیں تھا۔ مائیں انہیں لڑکیوں کی امید پر بچے پیدا کرتی ہیں تو لڑکیوں کو اپنا فرض بھی پورا کرنا ضروری تھا۔

اس گاؤں کی عورتوں سے مل کر مجھے بہت افسوس ہوتا زیادہ تر عورتیں سسرال جانا اور وہاں رہنا پسند نہیں کرتی۔ ایسی عجیب عجیب باتیں سسرال والے کے بارے

میں بتاتیں کہ مجھے یقین نہیں ہوتا ایک عورت نے بتایا کہ اس کی ساس نے گھڑے میں لال مرچ جلا کر اس کا منہ اس میں اندر کر دیا اور وہ بے ہوش ہوگئی اور مرنے والی تھی۔ دوسری نے بتایا میری ساس بہت بڑی ڈائن ہے اور ہم پر اس نے جادو کر دیا میرا پورا جسم جلنے لگا۔ اسی طرح شکایتیں ملیں اور اسی سب وجہ کر لڑکیاں سسرال سے مائکے آ کر بس جاتیں اور پھر جانا نہیں چاہتی۔ بلکہ ان کے شوہر ہی آ کر سسرال میں بس جاتے۔ جہالت اور مذہب سے دوری نے ان لوگوں کو دقیانوسی بنا دیا تھا۔

اس بستی کے مرد نہایت نکمے تھے عورتیں کھیتوں میں کام کرتی بھاری سے بھاری بوجھ اٹھاتی کما کر گھر چلاتی۔ اکثر مرد بیٹھ کر کھاتے اور عورتوں کو گالیاں بھی دیتے۔

اس گاؤں میں تعلیم کی شمع جلانے والی خاتون ہماری انوری باجی کو نا کامیابی ہی مل رہی تھی۔ اگر وہ لڑکیوں کو گھر بلا کر زبردستی پڑھاتیں تو گاؤں کی عورتوں کے ساتھ مرد بھی آ کر جھگڑ جاتے لیکن باجی استقلال کے ساتھ کوشش میں لگی رہتیں۔

میں تین ماہ بگودر میں رہی بڑے بڑے تجربے ہوئے۔ اکثر عورتیں دوسرے گھروں کی باتیں آ کر بتاتیں۔ ایک عورت نے کہا جانتی ہیں باجی سلّو بوا کی بات دو پراٹھے اس نے ڈالڈے میں داماد کے لئے بنایے لیکن کتا آ کر لے گیا لیکن سلّو بوا نے دوڑ کر اس کے منہ سے پراٹھے چھین لئے اور داماد کو کھلا دیا سب لوگ تو ہنسنے لگے لیکن مجھے غربت کا نمونہ نظر آیا۔

ایک دن کسی کے گھر سے دعوت آئی کچھ رنگین چاول لے کر ایک لڑکی آئی اور بولنے لگی ''میری باجی کی بارات کل ہے گھر پیچھے دو لوگوں کی دعوت ہے''۔ گھر پیچھے دو لوگوں کی دعوت کی بات مجھے سمجھ میں نہیں آئی تو باجی نے بتایا کہ یہاں گھر پیچھے ایک یا دو لوگوں کو ہی بلایا جاتا ہے ورنہ لوگ پورا خاندان لے کر پہنچ جاتے ہیں اور کھانا گھٹ

جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو جھگڑا اور مار پیٹ بھی ہو جاتی۔

میں انوری باجی کے ساتھ شرکت کے لئے گئی۔ جیسے ہی کھانا تیار ہونے کی خبر آئی بچے دوڑ پڑے ''بھات بن گئیل، بھات بن گئیل'' نعرہ لگاتے ہوئے کھانے کی طرف بڑھے۔ ان لوگوں کے چہروں پر چمک تھی اور پتل میں چاول ملا ایک شخص بالٹے میں شوربا اور تھالی میں گوشت لے کر آیا اور سب کو دینے لگا۔ بچے ''اور، اور'' کرنے لگے لیکن بانٹنے والے شخص نے اس کی آواز کو اَن سنی کر دیا اور وہاں سے ہٹ جانا ہی بہتر سمجھا۔

ایک دن ایک ادیباسی عورت نے مرغ مسلم بنانے کا طریقہ مجھے بتایا ''ہم لوگ مرغی کو اچھے سے باندھ دیتے ہیں اور بڑے پتیلا میں پانی ابال کر اسی میں مرغی کو ڈال دیتے ہیں اور ڈھکن اچھے سے بند کر دیتے ہیں اور بھاری چیز رکھ دیتے ہیں مرغی کی کھال گر جاتی ہے اسے اتار کر صاف کر کے نون (نمک) مرچائی کے ساتھ کھاتے ہیں۔ پھر ہنڈیا (بھات کو سڑا کر جو گھریلو شراب بنتی ہے) پیتے ہیں۔ زندہ مرغی کو اس طرح سے مرغ مسلم بنانے کا طریقہ سن کر تو میں تھرا گئی۔ کسی کے گھر میں (آدیباسی یا مسلمان) پیخانہ نہیں بنتا ہے مرد تو کسی وقت بھی میدان چلے جاتے ہیں لیکن عورتیں گروپ بنا کر صبح چار بجے رفائے حاجت کے لئے جاتیں ہیں۔ سب کے ہاتھ میں لوٹا ہوتا ہے سب گول دائرہ بنا کر بیٹھ کر ضرورت پوری کرتی ہیں بیڑی پیتی ہیں اور گپے کرتیں ہیں یعنی گول میز کانفرنس ہوتی ہے مجھے بڑی ہنسی آئی عجیب عجیب طریقے دیکھ کر۔

اس چھوٹے سے گاؤں میں کچھ عجیب باتیں دیکھنے اور سننے کو ملیں۔ ایک دن ایک بچے کو گرمی کے دنوں میں سوئیٹر پہنے دیکھ کر بہت تعجب ہوا پوچھا تو بولا ایک کرتا تھا وہ بھی گندا ہو گیا اماں نے یہ پہنا دیا۔ پھوہڑپن، جہالت اور غربت کا ملا جلا سنگم دیکھ

کر بہت افسوس ہوا۔

ادیباسیوں کی حالت مسلمانوں سے کچھ بہتر تھی خاص طور پر جو عیسائی ہو گئے ہیں ان لوگوں کا گھر صاف ستھرا اور سفید مٹی سے لیپا ہوا اور چونے کی چھاپ۔ ہر تیج تہوار میں اُن کے خوب صورت لباس اور ناچ بغیر کسی ٹریننگ کے ہی ان کے قدم اور تال اتنے اچھے جسے دیکھ کر خود ناچنے کی خواہش ہونے لگتی۔

جب میرے گھر آنے کے دن نزدیک ہونے لگے تو مجھے کچھ تحفے ملنے شروع ہوئے۔ ایک دن ایک ادیباسی عورت نے مجھے ایک شیشی سر میں لگانے کا تیل دیا اور کہنے لگی کہ آم کے اچار کا تیل ہے گرم ہوتا ہے جاڑے میں لگائیں بال سفید نہیں ہوتے۔ ایک عورت نے قرنج کا تیل لا کر دیا بتایا ہاتھ پیر میں تھوڑا سا لگالیں تو مچھر نہیں کاٹے گا۔ ایک عورت نے بینگ ساگ لا کر دیا اور کہا کہ "اسے سکھا کر رکھ لیں یہ پیلیا (جونڈس) میں فائدہ کرتا ہے"۔ ایک عورت نے مہوا کا پھل لا کر دیا جس سے شراب بنتی ہے۔ ایک مسلمان عورت نے مجھے چھلکا کھلایا (چاول کی وہ روٹی جس کے آر پار دکھائی دیتا ہے)۔ مجھے بہت سے چھوٹے چھوٹ تحفے ملے جیسے ایک لڑکی نے اپنے ہاتھ سے پھول بنا کر رومال دیا۔ ایک نے کچھ نیم کے داتون لا کر دیا۔ ایک چھوٹی بچی نے اپنے ہاتھوں سے کاغذ کی ناؤں اور پنکھا بنا کر دیا۔ گو اِن لوگوں میں غربت، جہالت اور پھوہڑپن تھا لیکن خلوص بھرا تھا۔ بار بار ان لوگ مجھے رکنے کو کہہ رہیں تھیں۔ خاطر مدارات چاہے وہ ماڑھ بھات سے کیوں نہ ہو مجھے بہت متاثر کیا۔

ان لوگوں کو پیسے جمع کرنے کا طریقہ بھی کچھ عجیب تھا۔ ایک عورت نے بتایا وہ روزانہ پکنے والے چاول سے ایک مٹھی چاول نکال لیتی ہے اور جب ایک سیر چاول ہو جاتا ہے تو وہ اسے خود ہی خرید لیتی ہے پھر اس پیسے کو ڈبے میں رکھ کر زمین میں گاڑ دیتی ہے۔

شادی بیاہ میں ایک دوسرے کی مالی مدد بھی کرنے کا طریقہ بھی بہت اچھا ہے مسلمانوں میں لڑکیوں کی شادی میں مسجدوں میں اعلان ہو جاتا ہے اور ہر شخص اپنے حساب سے تحفہ دیتا ہے جیسے گلاس، پلیٹ، بکس یا کپڑا۔ ادیباسیوں میں تو اور مزیدار تحفے آتے ہیں جیسے چاول، خصّی، مرغی، آلو، پیاز اور گھڑے میں ہنڈیا (گھریلو شراب) جسے پی کر عورت مرد سب مست ہو جاتے ہیں۔ اور سب ناچتے ہیں دولہا دلہن بھی ناچنے لگتے ہیں۔ ایک مرد مانڈر (بڑا ڈھول) کے دھن پر سب کو نچاتا ہے اور جوش دلاتا ہے۔ کرما تہوار میں نئے دھان کی خوشی میں ناچ گانا ہوتا ہے۔ کرما کا پودھا کان میں لگا کر خوشی مناتے ہیں۔ یہ ادیباسی چاہے کتنا ہی پڑھ لکھ لیں لیکن اپنی پرانی روائتوں کی ڈور کو کس کر پکڑے ہوئے ہیں۔ جینی شکار ادیباسیوں کا ایک بہت اہم تہوار ہے جو چند سال بیچ کر کے آتا ہے جس میں عورتیں تیر کمان لے کر چھوٹے جانوروں کا شکار کرتی ہیں اور پھر اسے گونتھ کر گلے میں پہن لیتی ہیں۔ ان تین ماہ کا وقت میری زندگی میں تجربے حاصل کرنے کا تھا۔ ادیباسی کلچر کو پاس سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ادیباسی ایک طرف ترقی کر رہے ہیں تو دوسری طرف اپنے کلچر کو بھلا نہیں سکتے ہیں۔ بزرگ عورتوں سے ہم نے ادیباسیوں کی کہانیاں سنی۔ سرہُل کا تہوار منانا۔ عورتیں اتنی محنتی ہوتی ہیں جنگل میں جا کر لکڑی چن کر لانا اور اسے بیچنا۔ مہوا لا کر اس کا استعمال کرنا۔ سر پر بھاری بھاری سامان لے کر ہفتہ واری بازار میں بیچنے جاتی ہیں۔ سر پر بھاری سامان اور پیٹھ پر بچا بندھا ہوا وہ لے کر میلوں پیدل چل لیتی ہیں۔

بگودر کا یہ تین ماہ کا وقت میری زندگی میں تجربہ حاصل کرنے کا، سبق سیکھنے کا تھا جو میں کبھی بھلا نہیں پاؤں گی۔ ہندو اور مسلمان دونوں قوموں سے میں بہت متاثر ہوئی دونوں ہی ذات کی عورتیں بہت محنتی تھیں۔

چند کانچ کی چوڑیاں

نصیر صاحب بارہ بجے لڑکھڑاتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ ہر دو چار دنوں پر ان کا یہی حال ہوتا تھا۔ اس نشے کی عادت کی وجہ کر دھیرے دھیرے زمین جائیداد، فروخت ہوتی جارہی تھی لیکن نصیر صاحب پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ بیوی کی ناراضگی پر یہ شعر پڑھنے لگتے تھے۔

ہنگامہ ہے کیوں برپا تھوڑی سی جو پی لی ہے
ڈاکہ تو نہیں ڈالا چوری تو نہیں کی ہے۔

نصیر صاحب کی اہلیہ فرحت بیگم کر بھی کیا سکتی تھیں۔ انہیں اِدھر اُدھر سے خبر ملتی کہ دھیرے دھیرے نصیر صاحب زمین و جائیداد کو فروخت کر رہے ہیں۔ شریف عورت آنسو بہا کر ہی رہ جاتیں۔ ایک نہایت شریف گھرانے کے مرد میں اس طرح کی بُرائی ہوگی انہوں نے امید بھی نہیں کی تھی۔ جب نصیر صاحب کے والدین زندہ تھے زبردست کھیتی تھی کہ اناج سے لے کر تیل مصالحہ سب گاؤں سے آتا تھا اور زندگی تو خوش گوار تھی لیکن نصیر صاحب کے والدین کے انتقال کے بعد تو نصیر صاحب من مانی کرنے لگے تھے۔ کوئی روک ٹوک نہیں تھی اور جو دل چاہتا وہ کرتے تھے۔ کچھ دکانیں اور ایک عدد مکان کو نصیر صاحب کے والد نے اپنی زندگی میں بہو کے نام سے کروادیا تھا دین مہر کے طور پر بہو کے نام پر ہوگیا تھا۔ اس کا کرایہ آتا اور زندگی کسی طرح گذر رہی تھی۔

ایک دن فرحت بیگم کو معلوم ہوا نصیر صاحب نے الماری سے کچھ زیورات بھی اُڑالئے اور فروخت بھی کردئے ہیں۔ فرحت بیگم رو پڑیں لیکن کیا کیا جاسکتا تھا۔ گھر مالی پریشانیوں سے جوجھ رہا تھا۔ دو چار دوکان اور ایک مکان کا کرایہ آتا تھا جس

سے گھر کا خرچ چلتا۔ والد کی زندگی میں ہی نصیر صاحب بے فکر رہتے تھے لیکن ان کے انتقال کے بعد تو وہ بالکل ہی غیر ذمہ دار ہو گئے تھے۔ نہ کبھی گاؤں جا کر کھیتی گرہستی کے طرف دھیان دیتے اور نہ گھر کی ذمہ داریوں کو سمجھتے۔ سوسائیٹی بھی ان کی خراب ہوتی جارہی تھی اور شراب کی لت نے تو ان کو کہیں کا نہ رکھا تھا۔ اچھے خاندان کا ایک اکلوتا بیٹا اس طرح کی گندی عادتوں میں مبتلا تھا۔ فرحت بیگم روتیں، سمجھانے کی کوشش کرتیں لیکن سب بے معنی ہو جاتا۔ کئی لوگوں نے فرحت بیگم کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ایسی زندگی سے تو بہتر ہے کہ تم طلاق لے لو ہر وقت کی کوفت کب تک برداشت کرتی رہوں گی۔ فرحت بیگم اپنی چند کانچ کی چوڑیوں کی طرف اشارہ کر کے کہتیں " کچھ نہ ملا شادی کے بعد لیکن چار عدد بچے ہیں میری خوشی کے لئے اور یہ چند کانچ کی چوڑیاں سہاگ کی نشانیاں ہیں اسے تو میں کسی قیمت میں کھونا نہیں چاہتی" اور بولنے والا ہمیشہ خاموش ہو جاتا۔ فرحت بیگم اچھے گھرانے کی ایک مذہبی اور روزہ، نماز کی پابند عورت تھیں۔ خاموشی سے سب برداشت کرتی جارہی تھیں۔ نصیر صاحب کو سیدھے راستے پر لانے کے لئے دعائیں کرتیں لیکن ایسا لگتا تھا کہ خدا نے ان کی دعاؤں کا اثر ہی ختم کر دیا تھا۔ پھر بھی وہ انہیں امیدوں میں جی رہی تھیں۔ شاید کبھی نصیر صاحب راہ راست پر آجائیں۔

فرحت بیگم اپنے کو دنیا میں بہت تنہا پاتیں تھیں۔ ساس سسر اور ماں باپ سب نے ساتھ چھوڑ دیا اور اللہ کو پیارے ہوئے۔ نصیر صاحب کے کوئی اپنے بھائی بہن تو تھے نہیں۔ فرحت بیگم کے بھائی بہن زیادہ تر پاکستان چلے گئے تھے۔ اکثر فرحت بیگم سوچتی تھیں۔ ماں بات نے پتہ نہیں لگایا اندرونی باتوں کا اکلوتا بیٹا اور زمین جائیداد پر شادی ہوگئی ان کی فرحت بیگم جب شوہر سے ناراض ہوتیں وہ باتوں کو مذاق میں اُڑا دیتے اور کہتے تھے، تم مجھ کو مئے خانے میں جانے کے لئے منع کرتی ہو

ہربنس رائے بچن نے کتنی اچھی بات کہی ہے۔

مندر مسجد بیر بڑھائے　　　　پیار بڑھائے مدھوشالہ

مدھوشالہ میں ہر مذہب کے لوگ ایک جگہ ہو جاتے ہیں۔ مسجد میں صرف مسلمان، مندر میں صرف ہندو اور کلیسا میں صرف عیسائی آتے ہیں۔ یعنی سب کا مذہب اور خدا الگ الگ ہے لیکن شراب خانے میں سب کا خدا صرف ایک ہے ساقی۔ غریب امیر سب ایک ہو جاتے ہیں۔ کوئی بدیشی شراب پیتا ہے، تو کوئی دیسی شراب اور کوئی تو ٹھرائی لیتا ہے میرے جیسا سیدھا انسان تو تاڑی پی کر بھی خوش ہو جاتا ہے۔ شراب خانے میں کوئی تعصب نہیں۔ امیر غریب کا فرق نہیں۔ جب سب پی لیتے ہیں تو ایک ہو جاتے ہیں اور سب ایک ساتھ خوشی مناتے ہیں۔

فرحت بیگم یہ سب باتیں سن کر خاموش ہو جاتیں بول ہی کیا سکتی ہوں۔

نصیر صاحب جب تاڑی پی کر آتے تو گانے لگتے۔

جب مریں تاڑی کے دن میں تاری سے نہلائیوں جی
تاڑ　کا　پتون　تاڑ　کا　کھٹون
تاڑ　کا　کھن　دلوئیو　جی
جب مریں تاڑی کے دن میں تاڑ تلے گڑوئیو جی
جب مریں تاڑی کے دن میں تاڑ تلے گڑوئیو جی

فرحت بیگم یہ سن کر افسردہ ہو جاتیں اور دعائیں کرتیں اے خدا میرے گناہوں کو معاف فرما اور میرے بچوں پر رحم کر۔

ایک دن فرحت بیگم کی بہن عشرت پاکستان سے اپنے دونوں لڑکوں کو لے کر آئیں۔ فرحت بیگم بہن کو دیکھ کر لپٹ گئیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ بہن کا حال چال تو ان کو پاکستان میں مل رہا تھا لیکن حالات اس حد تک خراب ہیں آ کر انہوں

نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

عشرت بیگم نے نصیر صاحب سے پوچھ لیا۔ ''نصیر بھائی کیا آپ کو خدا سے بالکل ڈر نہیں لگتا۔ مسلمان ہیں اور اس طرح شرابی بن کر گناہ کر رہے ہیں''۔

نصیر صاحب نے اپنی مخصوص ادا سے جواب میں تو برابر کہتا ہوں

زاہد شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر
یا وہ جگہ بتا دے جہاں خدا نہ ہو

''میں تو بہت دنوں سے اس جگہ کے تلاش میں ہوں جہاں خدا نہ ہو لیکن مجھے ایسی جگہ نہ ملی تو میں کیا کروں۔''

نصیر صاحب بول پڑے۔

میری تردامنی پر شیخ نہجائیو
دامن نچوڑ دوں تو فرشتے وضو کریں

بیگم پتہ نہیں کیوں تم میری شراب نوشی سے ناراض ہوتی ہو۔ بڑے بڑے شاعروں نے صرف شراب ہی نہیں پی بلکہ اپنی شاعری سے شراب کو زندگی بخشی ہے، تعریفیں کی ہیں۔ ہر طرح سے شراب کا ذکر کیا ہے۔ کہو تو میں دو چار شعر سنا دیتا ہوں۔

فرحت بیگم نے خاموشی اختیار کر لی۔ وہ جان رہی تھیں کہ آج نصیر صاحب کا نشہ کچھ زیادہ رنگ دکھا رہا ہے اور وہ اپنی بات سنا کر ہی رہنگے اور ہوا بھی وہی نصیر صاحب شراب کے لئے قصیدے پڑھنے لگے۔

مے کدہ معلوم ہوتا تھا جس وقت سحر
اوس پر مے کا کلی ہر جام کا دھولتا ہوا

دیکھو فرحت بیگم کس خوبصورتی سے شراب کا ذکر کیا گیا ہے۔ اب دوسرا شعر بھی سن لو۔

یہ بزم ہے یاں کوتاہ دستی ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اُٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

دیکھو بیگم میں شاعر تو ہوں ہی لیکن مے اور جام پر سیکڑوں اشعار مجھے زبانی یاد ہیں اور میں یہ دعا کرتا ہوں ان شاعروں کو اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے جنہوں نے شراب کو اتنے اچھے الفاظ میں پیش کیا ہے کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو میں ان کے ہاتھ چوم لیتا۔ دیکھو دیکھو کس خوبصورت الفاظ میں کسی شاعر نے کہا۔

مجھ تک کب آیا تیری بزم میں دور جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

شراب کوئی بری چیز نہیں ہے بیگم۔ ملاّ مولوی نے مل کر بدنام کرایا ہے دیکھ اس کا بھی ذکر ہے۔

واعظ و ساقی سے سر جوڑ کر بدنام کیا
ورنہ بدنام نہ ہوتی گلفام لوہی

کتنے خوبصورت الفاظ میں خمار بارہ بنکوی نے اپنے خیال کو بیان کیا۔

واعظ و ساقی میں ضد ہے بادہ کش چکر میں ہے
لب پر توبہ اور لب ڈوبا ہوا ساغر میں ہے

یہ درست ہے کہ واعظ ملا مولوی نے شراب جیسی پیاری چیز کو بدنام کر کے چھوڑ دیا ہے۔ سنو اس شعر کو سنو !

رات بھر خوب سی پی، صبح کو توبہ کر لی
رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

نصیر صاحب بولے جا رہے تھے سنو بیگم شراب بھی پی اور توبہ کر کے جنت کے مستحق بھی ہو گئے۔

مرزا غالبؔ کو بھی لوگوں نے بدنام کیا تھا مگر انہوں نے بھی بہت خوبصورتی سے جواب دیا ہے۔

غالبؔ شراب پینے سے کافر ہوا میں کیوں
کیا ایک چلو پانی سے ایمان بہہ گیا

نصیر صاحب اتنا بول کر خاموش ہو گئے وہ تھک بھی گئے تھے۔ فرحت بیگم نے خاموشی سے ان کے سامنے کھانا لا کر رکھ دیا جسے دیکھ کر نصیر صاحب خوش ہو گئے اور بول اُٹھے ''فرحت بیگم تمہیں بھی اللہ جنت الفردوس میں جگہ دیگا انشاء اللہ۔ تمہاری خاموشی میرے لئے دادِ تحسین ہے۔ دوسری گنوار عورت ہوتی تو چلانے اور لڑنے لگتی لا ذاب کھانا کا کھا کر سو جاتا ہوں''۔

مگر بیگم ایک شعر اور سن لو یہ میر تقیؔ میر نے کہا ہے۔

ساقی یہ ہجر یار میں دل سے کیا عہد
دیکھوں نہ آنکھ اٹھا کر شراب کی طرف

بیگم شراب تو واقعی میں بہت بری بلا ہے لیکن کیا کیا جائے انگور کی بیٹی میں کشش اتنی زیادہ ہے کہ ''چھوٹتی نہیں ہے کافر منھ سے لگی ہوئی'' لیکن کل سے چھوڑنے کی کوشش کروں گا انشاء اللہ۔ نماز میں بھی دُعا کرنا میرے لئے کہ میری یہ غلط عادت چھوٹ جائے۔

فرحت بیگم اُن کے یہ گھسے پٹے جملے سُن سُن کر تھک چکی تھیں۔ اس لئے بغیر جواب دیئے دسترخوان اُٹھا کر چلی گئیں اور نصیر صاحب سونے کے لئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ جس دن نصیر صاحب زیادہ پی لیتے فضول کی بکواس کرنے لگتے۔ فرحت بیگم سننے کی اور وہ بولنے کے عادی ہو چکے تھے۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

اس شعر کو پڑھتے ہوئے نصیر صاحب ڈگمگاتے قدموں سے کمر میں چلے گئے اور گنگنا رہے تھے۔

نشا پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزا تو جب ہے گرتوں کو تھام لے ساقی

عشرت بیگم نے بھی ان کی باتوں کے سامنے خاموش رہنا بہتر سمجھا۔ عشرت بیگم نے اپنے بڑے لڑکے سے فرحت بیگم کی بڑی لڑکی کی شادی طے کر دی اور بہت ہی سادگی سے عقد ہو گیا۔ اور وہ اپنی بہو عصمت اور بھانجے مبارک کے پاسپورٹ اور کاغذات کوشش کر کے دو ہفتہ کے اندر بنوا لئے۔ فرحت بیگم نے شکرانے کی نماز ادا کیا۔ فرحت بیگم نے اپنے ایک رشتہ دار کے یہاں باقی زیور کو چھپا کر رکھے تھے لے کر آئیں اور نصیر صاحب نے دیکھا تو چلا پڑے "میں چور ہوں جو دوسری جگہ زیور رکھتی ہو۔ کچھ زیور انہوں نے اپنی بڑی لڑکی عصمت کو دئے اور پاکستان روانہ ہونے سے قبل دونوں بہنیں لپٹ کر خوب روئیں۔ عشرت بیگم اپنی بہو عصمت اور فرحت بیگم کے اکلوتے لڑکے کو لے کر پاکستان روانہ ہو گئیں۔ فرحت بیگم کو خراب تو ضرور لگا لیکن اس ماحول سے بچے دور چلے گئے اس کا اطمینان ہی ہوا۔

عشرت بیگم کے پاکستان جانے کے بعد دو ہفتہ بعد ہی فرحت بیگم کی منجھلی بیٹی نکہت کی منسوب بھی رشتہ دار میں ہی طے ہو گئی وہ خوبصورت اور سلیقے مند تھی اس لئے آسانی سے لڑکے والے خود آ کر عقد کر کے سادہ طور پر رخصتی کرا لیا۔ ایک ماہ کے اندر فرحت بیگم کو دو دو خوشیاں ملیں۔ اللہ کا شکریہ ادا کیا۔ کچھ زیور دیکر اسے بھی رخصت کر دیا۔ گھر میں صرف فرحت بیگم اور چھوٹی بیٹی ندرت رہ گئیں تھیں۔ اللہ نے

ان کی دعائیں سن لیگا اور اتنی بڑی مدد کریگا یہ فرحت بیگم کو ایک خواب سا لگ رہا تھا۔

نصیر صاحب دن بھر اِدھر اُدھر رہتے اور رات کو اڈے پر چلے جاتے تھے۔ اِدھر ان کی طبیعت ٹھیک نہیں رہ رہی تھی۔ دو دن سے گھر میں پڑے رہے۔ تیسرے دن کہنے لگے۔ بیگم اِدھر میری طبیعت ناساز رہ رہی ہے۔ مجھے کچھ پیسے دیدو تو بڑی مہربانی ہوگی۔ کچھ پیسے شراب کے ادھار ہو گئے ہیں۔ سب ادا کر دوں خدا معلوم مرجاؤں گا تو تین گناہ کا جواب دینا ہوگا۔ ایک تو غیر ذمہ داری کا۔ دوسرا شراب پینے کا اور تیسرا ادھار کا۔ سب کو ادا کر دوں تو بہتر ہوگا اور رونے لگے۔ فرحت بیگم کو بہت افسوس لگا اور انہوں نے چند نوٹ ان کو پکڑا دئے اور وہ ڈگمگاتے ہوئے ان نوٹوں کو لے کر نکل گئے۔ دو گھنٹہ بعد ان کے موت کی منحوس خبر آئی۔ شراب خانے میں انہوں نے سب ادھار چکا دئے اور پھر دل کا دورہ پڑا۔ ڈاکٹر کے یہاں جانے سے پہلے ان کی روح پرواز کر گئی تھی۔ چند لوگ لاش لے کر آئے۔ فرحت بیگم اور ندرت کی رو رو کر بری حالت تھی۔ فرحت بیگم اپنی کانچ کی چوڑیوں کی طرف دیکھ کر رو رہی تھیں۔ اب یہ بھی میری نہ رہی اور انہوں نے چوڑیوں کو توڑ ڈالا۔

فرحت بیگم کہنے لگیں شکرانے کی نماز ادا کرونگی کہ کم از کم نصیر صاحب نے میری لاج رکھ لی۔ وہ زیادہ بیمار نہ پڑے۔ علاج کی ضرورت نہ پڑی ورنہ نہ معلوم کس کس کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا، مدد لینی پڑتی۔ محلے والوں نے جنازے کا انتظام کیا۔ پیسے فرحت بیگم نے ادا کئے۔ ایک ایک پیسے سب کو ادا کر دئے۔

کچھ دنوں کے بعد ہی فرحت بیگم چھوٹی بیٹی کو لے کر یہاں کی جائیداد فروخت کر کے پاکستان روانہ ہو گئیں۔ سنا ہے وہاں ہر طرح سے خوش ہیں۔ بیٹا بھی بڑے عہدے پر ہے اور لڑکیاں اپنی اپنی جگہ پر ہر طرح سے خوش خرم ہیں۔

★★★

DO KASHTI KE MOSAFIR

FARIDA ALAM